اُردو زبان کی قواعد

حصّہ دوم

شفیع احمد صدیقی ایم ۔ اے، بی ایڈ

اُن اساتذہ

کے

نام جو آج کے نامساعد حالات اور حوصلہ شکن تدریسی مسائل سے بددل نہیں ہیں بلکہ اپنے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کی بقا اور اس کے فروغ کے لئے نہ صرف قابلِ قدر جذبہ رکھتے ہیں بلکہ کوشاں بھی ہیں۔

"زبان نہ کسی کی ایجاد ہوتی ہے اور نہ کوئی اُسے ایجاد کرسکتا ہے جس اصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی ہے، پتّے نکلتے ہیں، شاخیں پھوٹتی ہیں، پھول لگتے ہیں اور ایک دن وہی ننّھا سا پودا ایک تناور درخت ہوجاتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔"

(مولوی عبدالحق)

اُردو زبان و قواعد

حصّہ دوم

(سیکنڈری، سینئر سیکنڈری اور جامعہ اردو علی گڑھ کے نصاب کے مطابق)

شفیع احمد صدّیقی ایم۔اے، بی۔ایڈ

اشاعت چہارم ________________ ۱۹۹۶ء
قیمت ________ ________ ۲۴ روپے
تعداد ________________ دو ہزار

تقسیم کار

۱۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار دہلی ۶	پرنس بلڈنگ بمبئی ۳	یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

۲۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، ایم۔ یو۔ مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

۳۔ سرسید بک ڈپو (جامعہ اردو) علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

۴۔ نیو بک ہاؤس 372/28 اولڈ آر۔ ٹی۔ او۔ آفس، ایم۔ سی سی "بی" بلاک دیونگر ۵۷۷۰۰۴ (کرناٹک)

مؤلف کا پتہ

شفیع احمد صدیقی 111/2-C لین ۸ ذاکر نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰

فون: ۶۹۱۸۳۳۴

فہرست موضوعات

(حصّہ دوم)

نمبر	موضوعات	صفحہ

صفحہ	موضوعات	نمبر شمار

پیش لفظ

اگرچہ اردو زبان کی داغ بیل آج سے تقریباً ایک ہزار سال قبل پڑ چکی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی نشو ونما اور ترقی پچھلے چار سو سالوں میں ہوئی۔ کسی زبان کو بامِ عروج پر پہنچنے کے لئے یہ عرصہ بہت تھوڑا ہے مگر اردو زبان اپنی شیریں زبانی اور لطافتِ بیانی کے باعث دیگر زبانوں کے مقابلہ میں بہت جلد ہر دلعزیز اور معیاری زبان بن گئی۔ اردو زبان کے سیکھنے کے سلسلہ میں یہ عرض کر دوں کہ اردو ہی کیا، کوئی بھی زبان ہو جب ہم اُس کو سیکھنا چاہتے ہیں یا اس سے واقف ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے:

① جو کچھ ہم دوسروں کی زبان سے سنیں یا کتابوں میں پڑھیں اس کو بخوبی سمجھ لیں۔

② جو کچھ ہم محسوس کرتے یا سوچتے ہیں اس کو اچھے ڈھنگ سے حسب ضرورت بیان کر سکیں۔

③ جو کچھ ہم بیان کر سکتے ہیں اس کو خوبصورت پیرایہ میں لکھ بھی سکیں۔

جب زبان کے مذکورہ بالا تینوں پہلوؤں پر ہم کو قدرت حاصل ہو جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں زبان ہمیں آتی ہے۔ چنانچہ اردو زبان کو بھی اسی نظریہ کے تحت مدارس میں سکھایا اور پڑھایا جاتا ہے۔

کوئی بھی کام ہو اگر قاعدے کے ساتھ کیا جائے تو نہ صرف آسان ہو جاتا ہے بلکہ اس میں باقاعدگی اور خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے۔ بالکل یہی بات زبان کے سیکھنے پر بھی صادق آتی ہے۔ چنانچہ اہلِ زبان نے اردو کو ٹھیک ڈھنگ سے بولنے اور لکھنے کے کچھ اصول، ضوابط اور قاعدے متعین کئے ہیں جسے ہم " اردو قواعد" کہتے ہیں۔ انھیں قواعد کی پابندی اور انشاء کی مشق سے ہم اردو زبان اچھی طرح سیکھ سکتے ہیں یا سکھا سکتے ہیں۔

افسوس ہے کہ اردو کے حق میں ان بدلتے ہوئے حالات کے تحت اردو کی درسی یا نصاب سے متعلق دیگر معاون کتابوں کے لکھنے کی طرف روز بروز توجہ کم ہوتی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو زبان کے طَلَبہ کے لئے اردو قواعد اور انشا کی کوئی معیاری کتاب دستیاب نہیں ہے۔ اگر بعد تلاشِ بسیار کوئی کتاب ہاتھ بھی لگ گئی تو وہ بہت ہی مختصر اور جزوی ہوتی ہے یا بہت ہی تفصیلی اور طَلَبہ کے معیار سے بلند، دونوں صورتوں میں ثانوی درجات کے طَلَبہ و طالبات استفادہ نہیں کرپاتے جس کے نتیجہ میں اردو زبان کے طلبہ "**اردو زبان و قواعد**" کی کتاب کی کمی کو شدت سے محسوس کررہے ہیں۔

راقم الحروف نے طَلَبہ کی ضروریات کے پیشِ نظر اپنی محدود معلومات کے باوجود اس کتاب کو صرف تدریسی تجربات کی روشنی میں اس طرح ترتیب دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ قواعد کے موجودہ نظریۂ تعلیم کے مطابق عملی قواعد سے قریب تر ہو۔ علاوہ ازیں ان تمام بنیادی باتوں اور معلومات کو جنھیں اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے ان کا ذکر اگر تفصیلی نہ سہی تو اجمالی طور پر ضرور ہو جائے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ تو قارئین حضرات اس کتاب کے دونوں حصّوں کو پڑھ کر ہی کریں گے۔
اردو زبان و قواعد کے سب ہی اہم موضوعات کو کتاب کے ایک ہی حصّہ میں شائع کرنے کا خیال تھا مگر میرے مخلص و مدبر دوستوں نے جماعت کے لحاظ سے طَلَبہ کی وقتی ضرورت، کتاب کی ضخامت اور اس کی قیمت کے پیشِ نظر اسے دو حصّوں میں شائع کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ پہلا حصّہ مڈل تا سکنڈری اور دوسرا حصّہ سکنڈری تا سینئر سکنڈری کے طَلَبہ کے لئے ان کے جماعتی معیار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ترتیب دے کر شائع کرایا گیا۔ زیرِ نظر کتاب سیکنڈری سینئر سیکنڈری جامعہ اردو علی گڈھ کے طَلَبہ کے لئے نہ صرف امتحانی نقطۂ نظر سے مفید ہوگی بلکہ اُن کے معیارِ اردو کو بڑھانے اور اردو زبان سے دلچسپی پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ مذکورہ جماعتوں کے طَلَبہ کو ان کی ضروریات

کا بیشتر حصہ اسی کتاب میں مل جائے گا اور اُن کو اِدھر اُدھر بھٹکنا نہیں پڑے گا۔

میں جناب صفدر عباس صاحب نقوی (سابق پرنسپل شفیق میموریل سینئر سیکنڈری اسکول) کا بہت ممنون ہوں۔ وہی اس کتاب کے محرّک ہیں۔ انھیں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی نے میرے ارادے کو عملی جامہ پہنایا۔ علاوہ ازیں اُن تمام حضرات کا بھی میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً اس کتاب کے موضوعات اور ان کی ترتیب کے سلسلہ میں اپنے گرانقدر مشوروں سے مجھے نوازا، خصوصاً جناب پروفیسر مسعود حسین خان پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم صاحب، ڈاکٹر شریف احمد صاحب، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی صاحب، پروفیسر عتیق احمد صدیقی صاحب، پروفیسر نورالحسن نقوی صاحب، ڈاکٹر محمد صابرین صاحب، پروفیسر محمد ذاکر صاحب، پروفیسر آفاق حسین صدّیقی صاحب، ڈاکٹر خالد محمود صاحب اور جناب محمّد نفیس صاحب کے نام اس ضمن میں قابلِ ذکر ہیں۔

شفیع احمد صدّیقی

C-111/2 لین نمبر ۸ ذاکر نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

فون: ۶۹۱۸۳۳۴

تعارف

شفیع صاحب کا یہ تالیفی نوعیت کا کام ہے اور اچھا کام ہے۔ وہ خود بھی ایک معلّم ہیں جن کا ایک ثلث صدی سے زیادہ وقت پڑھنے اور پڑھانے میں گزر چکا ہے۔ اس اثنا میں انھیں اردو کے طلبہ وطالبات کو مختلف سطحوں پر زبان و قواعد سکھانے کا جو تجربہ ہوا اور اس ضمن میں زمانہ بہ زمانہ بڑھتی ہوئی جن دشواریوں کو وہ محسوس کرتے رہے ان کے پیشِ نظر انھوں نے اردو زبان و قواعد کی یہ کتاب مرتب کی ہے جو دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ اس کام میں ظاہر ہے کہ ان کے ساتھیوں کا مشورہ بھی شامل رہا ہوگا۔ اردو زبان و قواعد کا حصّہ اوّل چھٹی تا نویں اور حصّہ دوم نویں تا بارہویں جماعت کے طلبہ کے لئے ہے جو ان کے نصاب اور اردو زبان سے متعلق متفرق معلومات بہم پہنچانے کے خیال سے لکھی گئی ہے اِن کتابوں کی ترتیب میں "جامعہ اردو علی گڑھ" کے نصاب کو بھی مدِّ نظر رکھا گیا ہے۔

زبان و قواعد پر لکھنا ایک مشکل کام ہے اس لئے کہ اس کا تعلق انشا پردازی، خیال آرائی اور مضمون بندی سے نہیں، اس کے لئے زبان کی ساخت، اس کے محاورے، روزمرہ لفظیات، صرف و نحو، قواعد و لغت اور انشا سے متعلق مختلف موضوعات سے رجوع کرنا، نیز بہ نظرِ غائر متعلقہ کتب کا مطالعہ کرنا ازبس ضروری ہوتا ہے۔ انھوں نے سالہاسال اپنے اس مطالعہ کو جاری رکھا۔ ان کے طویل تجربہ نے اردو زبان سے متعلق مڈل تا سینئر سیکنڈری درجات کی تدریسی و نصابی دشواریوں کو آسان تر بنا کر پیش کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ اِس پر آمادہ ہوئے کہ طلبہ کے لئے ان موضوعات پر کچھ لکھیں جن کی شدید ضرورت تھی۔ جو کچھ انھوں نے سمجھا ہے، زبان و قواعد کے مطالعہ اور تجربات کی روشنی میں سمجھا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کتاب کے دونوں حصّوں کے ذریعہ وہ طلبہ وطالبات نیز اساتذہ تک اسے پہنچا رہے ہیں۔ انھوں نے خود بھی اس کا اظہار کیا ہے کہ یہ کتابیں مڈل، سیکنڈری، سینئر سیکنڈری اور جامعہ اردو علی گڑھ کے طلبہ کی نصابی ضروریات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں، مذکورہ

جماعتوں کے لئے قواعد و انشاء کے علاوہ تاریخ اردو کے ان تمام موضوعات کو یکجا کیا ہے جو تلاشِ بسیار کے باوجود طلبہ حاصل نہیں کر پاتے۔ اردو زبان کے طلبہ کے لیے ان موضوعات پر اب تک ایسی کوئی کتاب دستیاب نہیں تھی جو طلبہ کے جماعتی معیار اور درسی نصاب کے مطابق مختصر نیز آسان زبان میں ہو اور جس میں تمام ضروری معلومات یکجا کی گئی ہوں۔ توقع ہے کہ ان دونوں کتابوں سے اردو زبان کے اساتذہ بھی حسب ضرورت استفادہ کر سکیں گے۔

ہمارے یہاں بڑے بڑے ادبی موضوعات پر لکھنے والے تو موجود ہیں۔ لیکن نصابی ضروریات کے پیشِ نظر لکھنے اور مناسب کتابیں تیار کرنے والے بہت کم ہیں۔ اس اعتبار سے شفیع صاحب کی یہ محنت قابلِ داد ہے۔ انھوں نے بہت سی درسی کتابوں کی ورق گردانی کرکے اپنے لئے ضروری مواد فراہم کیا ہے اور اس کتاب کے دونوں حصّوں میں اردو زبان سے متعلق تقریباً ستر (۷۰) موضوعات کو بڑے سلیقہ سے ترتیب دیا ہے خصوصاً "صرف و نحو" "صنائع و بدائع" خطوط اور مضمون نویسی کے اصول و آداب کے ساتھ ساتھ بہت سے نمونے، ڈیڑھ سو سے زائد تلمیحات اور ان کا پس منظر نیز اردو ٹسٹ پیپرس کے نمونے وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کتابوں سے مدد لے کر جو اساتذہ پڑھائیں گے یا طلبہ استفادہ کریں گے وہ ان کی افادیت کے بارے میں صحیح طور پر فیصلہ کر سکیں گے۔ میں جس حد تک ان کتابوں کو دیکھ سکا ان کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ دونوں کتابیں مفید مطلب ہیں اور شفیع صاحب کی یہ محنت اور لگن قابلِ ستائش ہے۔ علاوہ ازیں مؤلف کی اِس تحریر سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ 'اردو زبان و قواعد' کے دونوں حصّے طلبہ کے لئے نہ صرف امتحان کی تیاری کے نقطۂ نظر سے مفید ہیں بلکہ ان کے معیارِ اردو کو بڑھانے اور قواعد جیسے خشک موضوع سے دلچسپی پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

مجموعی طور پر "اردو زبان و قواعد" کے دونوں حصّے اردو زبان کے طلبہ نیز اساتذہ کے لئے بہت مفید ہیں۔ مؤلف نے موجودہ دور کے حالات و مشکلات کا صحیح اندازہ کرکے اردو زبان کے طلبہ اور طالبات کے لئے ایک قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔

تنویر احمد علوی

الفاظ اور معانی

جیسا کہ اس کتاب کے حصہ اوّل میں کہا گیا ہے کہ "حرف" لفظ کا اور "لفظ" جملے کا سب سے چھوٹا جزو ہوتا ہے۔ الفاظ موضوع کا استعمال گفتگو اور لکھنے پڑھنے میں ہوتا ہے جس کے کوئی نہ کوئی معنیٰ ہوتے ہیں لیکن جملہ سے الگ خالی لفظ محض لفظ ہوتا ہے اس سے کوئی خاص مطلب یا مفہوم نہیں نکلتا۔ تحریر میں تو لفظ کی صورت نہیں بدلتی لیکن اردو زبان کے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو بول چال، لب و لہجہ اور تحریر میں موقع استعمال کے لحاظ سے مختلف موقعوں پر مختلف معنی دیتے ہیں۔ یہ معنی تین طرح کے ہوتے ہیں :۔

(۱) لغوی معنی

(۲) اصطلاحی معنی

(۳) مجازی معنی

۱۔ لغوی معنی :۔ لغت کے اعتبار سے لفظ کے جو معنیٰ ہوتے ہیں ہم اسے لغوی معنیٰ کہتے ہیں۔ اس کو ہم اصلی یا حقیقی معنیٰ بھی کہتے ہیں۔ ہمارا واسطہ عام طور سے لغوی معانی سے زیادہ پڑتا ہے۔ مثلاً

روغن = تیل ، عشوہ = ناز و ادا ، نیّرِ اعظم = سورج

۲۔ اصطلاحی معنیٰ :۔ عام لوگ جب کسی لفظ کے اصلی معنیٰ سے ہٹ کر اس کو دوسرے معنی میں استعمال کرنے لگتے ہیں اور عوام میں وہ اس قدر رائج ہو جاتے ہیں کہ پھر اس کے لغوی معنی کی طرف نہ تو دھیان جاتا ہے اور نہ اس سے عام

لوگوں کو واقفیت ہوتی ہے۔ مثلاً :۔

(۱) "تہجد" کے لغوی معنیٰ ہیں "رات میں جاگنا" مگر عام بول چال میں وہ نماز مراد ہے جو نصف شب کے بعد پڑھی جاتی ہے۔

(۲) قصیدہ کے لغوی معنی ہیں "مغز یا گودا" مگر اصطلاح میں ان اشعار کو کہتے ہیں جن میں کسی کی تعریف یا مذمت کی گئی ہو۔

(۳) مجازی معنیٰ :۔ جب اہل زبان کسی لفظ کو اس کے لغوی معنیٰ کے بجائے کسی اور معنی میں استعمال کرتے ہیں جس کا تعلق لغوی معنی سے بہت دور کا ہوتا ہے ایسے معنی کو ہم مجازی معنی کہتے ہیں۔ مثلاً :۔

(۱) "نرگس" لغوی اعتبار سے "ایک پھول کا نام" ہے مگر مجازاً "آنکھ" کے معنی میں مستعمل ہے۔

(۲) "گلفام" اس کے لغوی معنیٰ ہیں "گلاب کے پھول جیسا رنگ" مگر مجازی معنیٰ میں "معشوق" کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

روزمرّہ کی تعریف

روزمرّہ کے معنیٰ ہیں "ہمیشہ، ہر روز" یہاں مراد اُن الفاظ اور جملوں سے ہے جو روزمرّہ یا ہر روز کی زندگی میں بولے جاتے ہیں۔ "روزمرّہ" زبان کے الفاظ کی وہ ترتیب، اوزان اور بندش ہے جس کو اہلِ زبان نے اپنی تحریر و تقریر میں اپنایا ہو۔ محاورے کی طرح اس میں بھی تصرف یعنی اپنی طرف سے الفاظ کو گھٹانے بڑھانے یا ان کی ترتیب وغیرہ کے بدلنے کا بالکل اختیار نہیں ہے بلکہ روزمرّہ کے استعمال میں اہلِ زبان کی تقلید لازمی ہے۔ خواہ نظم ہو یا نثر دونوں میں ان کے استعمال کئے ہوئے روزمرّہ کو جیوں کا تیوں برقرار رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً :۔

تمہارا "ہر روز" کا یہ معمول ہے۔ "دو چار روز" کی بات ہے۔ اس کو اگر ہم اس طرح

بولیں کہ "تمہارا ہر دن کا یہ معمول ہے"۔ "دو پانچ روز کی بات ہے"۔ تو یہ روزمرہ کے بالکل خلاف ہو گا۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اہلِ زبان کی عام بول چال اور ان کے اسلوبِ بیان کا دوسرا نام "روزمرہ" ہے۔ فصیح عبارت کے لئے لازم ہے کہ اس میں روزمرہ کا ٹھیک ٹھیک استعمال کیا گیا ہو۔ یہ یاد رکھیے کہ روزمرہ میں اس کے الفاظ اپنے اصلی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے مجازی یا غیر حقیقی معنی نہیں لئے جاتے۔ "پانچ سات"، "ہو نہ ہو"، "کچھ نہ کچھ"، "آئے دن"، "ایک نہ ایک دن"، "روز روز" وغیرہ۔ یہ الفاظ روزمرہ ہیں جو اپنے اصلی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ عبارت میں روزمرہ کو نظرانداز کرنے سے اس کی فصاحت جاتی رہتی ہے اس لئے اچھی عبارت کے لئے اچھے روزمرہ کا استعمال بہت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صنعتِ روزمرہ کو بامحاورہ زبان کے لئے لازمی سمجھا جاتا ہے۔ روزمرہ کے استعمال کی بہترین مثالیں ذیل کے اشعار میں دیکھئے۔ یہ اشعار علاّمہ ظریف لکھنوی کی ایک نظم کے ہیں جس کا عنوان "جہاز کا دلچسپ سفر" ہے۔

کیا چھوٹی سیڑھیاں ہیں نگوڑی خدا کی مار
ایسا جہاز، نوج ہو درگور دور پار
ہلتی بھی ہیں نگوڑیاں جن کو نہیں قرار
رسّی میں ڈنڈے باندھ دیئے ہیں گے پانچ چار
زینہ نگوڑ ماروں نے کیسا بنایا ہے
یہ تو موؤں نے نٹ کا تماشا بنایا ہے

اگرچہ ان اشعار میں ادبی زبان کے پرشکوہ الفاظ کا استعمال نہیں ہوا ہے مگر پھر بھی نسوانی محاورے اور صنعتِ روزمرہ کا استعمال برمحل اور برجستہ ہے اس لئے یہ اشعار فصیح کہلائیں گے۔

محاورہ کی تعریف

محاورہ کے معنی ہیں گفتگو کرنا" یا "ہم کلام ہونا" لیکن اہلِ زبان کی اصطلاح میں دو یا دو سے زیادہ الفاظ کے اُس مجموعہ کو محاورہ کہتے ہیں جو کسی نہ کسی مصدر سے مل کر بنا ہو اور اپنے حقیقی معنی کے بجائے کسی دوسرے مجازی معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہو۔ جیسے:۔ "بوجھ سر پر اٹھانا" یہاں پر "اٹھانا" اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس لئے بوجھ سر پر اٹھانا محاورہ نہیں کہلائے گا جبکہ "آسمان سر پر اٹھانا" محاورہ ہے کیونکہ یہاں پر "اٹھانا" مصدر اپنے حقیقی معنی میں نہ استعمال ہو کر مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہی بات تمام محاوروں میں پائی جاتی ہے مثلاً "پتھر کی لکیر ہونا"۔ "نظر سے گرنا"۔ "بال کی کھال اتارنا"۔ "آنکھوں پر بٹھانا" وغیرہ محاورے ہیں کیونکہ ان میں تمام مصادر "لکیر ہونا" "گرنا" "اتارنا" اور "بٹھانا" اپنے اصلی معنوں میں استعمال نہ ہو کر غیر حقیقی یا مجازی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں ؎

سر دیجئے راہِ عشق میں پر منہ نہ موڑیئے
پتھر کی سی لکیر ہے یہ کوہکن کی بات

کہاوتوں کی طرح بیشتر محاوروں کا بھی کوئی نہ کوئی پسِ منظر ہوتا ہے جیسے "بیڑا اٹھانا" "ٹیڑھی کھیر ہونا" ان محاوروں کے پیچھے جو واقعہ یا کہانی پوشیدہ ہے اُسے کون نہیں جانتا۔ محاوروں کا استعمال کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس میں کسی قسم کی کمی بیشی یا ترمیم و تنسیخ اپنی طرف سے نہیں کر سکتے۔ محاوروں کو اسی صورت میں قائم رکھنا ضروری ہے جس صورت میں اہلِ زبان نے ان کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً "نو دو گیارہ ہونا" محاورہ ہے۔ ہم یہ سوچ کر کہ کیا ضروری ہے کہ نو دو گیارہ ہوں، سات چار یا چھ یا پانچ بھی تو گیارہ ہوتے ہیں اس لئے اس کو محاورہ کے طور پر اس طرح کہیں کہ "پولیس کو دیکھتے ہی چور سات چار گیارہ ہو گئے" تو یہ سراسر غلط ہو گا۔ محاوروں میں اس طرح کی تبدیلی یا تصرف کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔

اردو زبان کے ماہرین نے اسماء اور اشیاء کے اعتبار سے محاوروں کو مختلف خانوں میں تقسیم کیا ہے جیسے :۔

(۱) حیوانی محاورے (۲) نباتاتی محاورے (۳) اعضائی محاورے (۴) خورد و نوشی محاورے (۵) پوشاکی محاورے (۶) موسمی محاورے (۷) فلکیاتی محاورے (۸) عددی محاورے (۹) نفسیاتی محاورے (۱۰) آبی محاورے ۔

نظم و نثر میں محاوروں کی حیثیت "صنائع و بدائع" جیسی ہے ۔ دیکھئے ذیل کی مختصر سی عبارت میں محاوروں نے کیا جان ڈال دی ہے :۔

"یہاں تو سارے جنم کی کمائی مٹی میں مل گئی ۔ مُردہ منحوس بیل دیا تھا۔ اُس پر دام مانگتے ہیں ۔ آنکھ میں دھول جھونک دی ۔ مرا ہوا بیل گلے باندھ دیا۔ نِرا اُلّو ہی سمجھ لیا ہے ۔ کسی گڑھے میں منہ دھو آؤ تب دام لینا"۔ (منشی پریم چند)

محاورہ اور روزمرّہ کا فرق

"محاورہ" کے لغوی معنی بات چیت کرنے کے ہیں جبکہ روزمرّہ کے معنی "ہر روز" ہیں

محاورہ اور روزمرّہ میں حسب ذیل فرق ہے :۔

(۱) "روزمرّہ" الفاظ کی وہ خاص ترتیب ہے جس کو اہلِ زبان نے اپنا لیا ہے اور ان کا استعمال عام بول چال میں بے ساختہ ہوتا ہے جبکہ "محاورہ" دو یا دو سے زائد الفاظ کے ذریعہ بنے ہوئے مخصوص الفاظ کے مجموعے کا نام ہے ۔

(۲) ان کا بنیادی فرق یہ ہے کہ محاورے کا اطلاق اُن افعال پر کیا جاتا ہے جو تمام تر مجازی (غیر حقیقی) معنی میں استعمال ہوتے ہیں جبکہ روزمرّہ کے الفاظ اپنے لغوی (حقیقی) معنیٰ میں استعمال ہوتے ہیں ۔ جیسے :۔

مثال ۱؎ (۱) تصویر اتارنا ۔ یہاں "اتارنا" اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے ۔

(۱۱) دل سے اتارنا ۔ یہاں "اتارنا" غیر حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے ۔ اس طرح معلوم ہوا کہ "دل سے اتارنا" محاورہ ہے اور "تصویر اتارنا" روزمرّہ ۔

مثال ۲؎ (۱) "تین تیرہ کرنا" ۔ "انیس بیس کا فرق ہونا" ۔ یہ محاورے ہیں ان کے اعداد اپنے حقیقی معنی میں استعمال نہ ہو کر غیر حقیقی معنی میں لئے گئے ہیں ۔ اس کے بر خلاف :۔

(۱۱) ایک دو (روز) ۔ دو چار (ساتھی) پانچ سات (لڑکے) دس بیس (روپے) وغیرہ روزمرّہ ہیں جو اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں ۔ ان کا استعمال اسی پابندی اور ترتیب کے ساتھ اہلِ زبان پر لازم ہے ۔

۳ ۔ عبارت میں اگر محاورہ کا استعمال نہ کیا جائے تو اس میں کوئی نقص نہیں آتا اور اس کی فصاحت باقی رہتی ہے جبکہ روزمرّہ کو نظرانداز کرنے یا اس کی پابندی پر قائم نہ رہنے سے عبارت ناقص اور غیر فصیح ہو جاتی ہے ۔

۴ ۔ روزمرّہ میں سیدھے سادے اور آسان فقرے ہوتے ہیں جن کے الفاظ کا صوری اور معنوی مطلب ایک جیسا ہوتا ہے مثلاً تمہارے لئے تو "عیش ہی عیش ہے"۔ اس کے برعکس محاوروں میں روزمرّہ جیسی سلاست نہیں پائی جاتی کیونکہ محاورات کے الفاظ اپنے حقیقی یا لغوی معنی سے ہٹ کر اصطلاحی یا اشارتی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اس لئے ان کے صوری اور حقیقی معنوں میں یکسانیت نہیں رہتی ۔

۵ ۔ محاورے عموماً مصدر کی علامت "نا" کے ساتھ ہوتے ہیں مثلاً "خاک چھاننا" "انگلی پر نچانا"۔ محاورے جب جملوں میں استعمال کئے جاتے ہیں تو مصدر کی علامت "نا" کو اردو قواعد یعنی زمانہ، تذکیر و تانیث اور واحد جمع کے اعتبار سے فعل میں بدل دیتے ہیں ۔

۶ ۔ محاورات میں اردو قواعد کی پابندی بہت حد تک ضروری ہے جب کہ روزمرّہ قواعد کی پابندیوں سے بہت حد تک آزاد ہیں ۔

نوٹ :۔ محاورہ اور روزمرّہ میں جہاں مندرجہ بالا فرق ہیں وہاں ایک بڑی یکسانیت بھی ہے کہ دونوں میں کسی طرح کا تصرف نہیں کیا جا سکتا ۔ یعنی انھیں اسی طرح استعمال کرنا لازم ہے جس طرح کہ اہلِ زبان نے کیا ہے ۔ مثلاً اوپر کے محاوروں اور روزمرّہ کو ہم اس طرح استعمال کریں تو وہ نہ محاورے کہلائیں گے اور نہ روزمرّہ :۔

(۱) قلب سے اتارنا ۔ تین پندرہ کرنا ۔ انیس اکیس کرنا وغیرہ (یعنی تصرف بے جا کے ساتھ) (۱۱) ایک تین ۔ دو چھ ۔ پانچ نو ۔ دس سولہ وغیرہ (یعنی روزمرّہ کی پابندی سے ہٹ کر) ۔

محاورات

محاورات	مطلب
ایک جان دو قالب ہونا	گہری دوستی ہونا۔
آٹھ آٹھ آنسو رونا	بہت رونا۔
آج کل کرنا	ٹال مٹول کرنا۔
آڑے آنا	مشکل میں مدد کرنا۔
آستین کا سانپ ہونا	دوست بن کر دشمنی کرنا۔
آسمان ٹوٹ پڑنا	سخت مصیبت آنا۔
آسمان زمین ایک کرنا	بہت کوشش کرنا۔
آگ برسنا	سخت گرمی پڑنا۔
آگ پر تیل ڈالنا	غصّہ کو اور بڑھا دینا۔
آنچ آنا	نقصان پہنچنا۔
آنسو پونچھنا	تسلّی دینا۔
آنکھیں بچھانا	تعظیم کرنا۔ استقبال کرنا۔
آنکھیں بدلنا	بے توجہی یا بے رخی برتنا۔
آنکھیں کھلنا	حقیقت معلوم ہونا۔
آنکھیں دکھانا	غصّہ دکھانا۔
آنکھوں کا کاجل چرانا	دھوکا دینا۔
آنکھوں پر بٹھانا	عزّت کرنا۔
آنکھ ملانا	سامنے آنا۔
آنکھوں میں کھٹکنا	ناگوار لگنا۔

محاورات	مطلب
آنکھیں چار ہونا	آمنے سامنے ہونا۔
انگلی پر نچانا	قابو میں کر لینا۔
ایک لاٹھی سے سب کو ہانکنا	سب کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرنا۔
ایڑیاں رگڑنا	مصیبت میں زندگی بسر کرنا۔
اپنے منھ میاں مٹھو بننا	اپنی تعریف آپ کرنا۔
اپنے پاؤں میں کلاڑھی مارنا	اپنا نقصان آپ کرنا۔
انگشت بدنداں ہونا	حیران ہونا۔
اوس پڑنا	شرمندہ ہونا۔ مایوس ہونا۔
ایک اور ایک گیارہ	اتحاد میں طاقت ہے۔
ایک آنکھ سے سب کو دیکھنا	سب کو برابر سمجھنا۔
آنتوں کا قل ہو اللہ پڑھنا	بہت بھوک لگنا۔
باغ باغ ہونا	پھولا نہ سمانا، بہت خوش ہونا
بال کی کھال اتارنا یا نکالنا	نکتہ چینی کرنا۔ چھان بین کرنا۔
بٹہ لگانا	بدنام کرنا۔
بیڑا پار ہونا	مشکل آسان ہونا۔
بیڑا اٹھانا	ذمہ داری لینا۔
پردہ ڈالنا	کسی بات کو چھپانا۔
پالا پڑنا	کام ہونا۔ واسطہ پڑنا۔
پانچوں انگلیاں گھی میں ہونا	بہت عیش کی زندگی گزارنا۔
پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔	بہت احتیاط سے کام لینا۔
پاؤں دھو کر پینا	بہت عزت کرنا۔

محاورات	مطلب
پگڑی سنبھالنا	عزت بچانا۔
پھوٹ پھوٹ کر رونا	بہت رونا۔
پیٹ کی آگ بجھانا	بھوک مٹانا۔ کھانا کھالینا۔
پیٹھ نہ لگنا	چین نہ ملنا۔
پیٹھ دکھانا	ہار جانا۔
پیٹ کا ہلکا ہونا	چغلی کرنے والا۔
پانی سر سے اونچا ہونا	بات بہت آگے بڑھ جانا۔
پانسہ پلٹنا	اچانک حالت میں تبدیلی آجانا۔
پتھر تلے ہاتھ دبنا	مجبور ہونا۔
پیٹ میں چوہے دوڑنا	بہت بھوک لگنا۔
تو تو میں میں کرنا	جھگڑا کرنا۔
تھالی کا بیگن ہونا	اپنی جگہ پر قائم نہ رہنا۔
تین پانچ کرنا	فضول باتیں بنانا۔
تین میں نہ تیرہ میں	کسی گنتی میں نہ ہونا۔ کوئی قدر نہ ہونا۔
تارے گننا	جاگتے رہنا۔ نیند نہ آنا۔
تکیہ کرنا	بھروسہ کرنا۔
ٹوپی اچھالنا	ذلیل کرنا۔ خوش ہونا۔
جوتیوں میں دال بٹنا	نا اتفاقی ہونا۔
جال بچھانا	فریب کرنا۔
جان میں جان آنا	اطمینان ہونا۔
چراغِ سحری ہونا	مرنے کے قریب ہونا۔

محاورات	مطلب
چراغ تلے اندھیرا ہونا	اپنے لوگوں کو فائدہ نہ پہنچ کر دوسروں کو فائدہ پہنچانا
چراغ لے کر ڈھونڈنا	بہت تلاش کرنا۔
چشم پوشی کرنا	عیب چھپانا۔
چکنا گھڑا ہونا	بے غیرت ہونا۔
چولی دامن کا ساتھ ہونا	ہر وقت کا ساتھ ہونا۔
چھٹی کا دودھ یاد آجانا	مصیبت میں پچھلا آرام یاد آنا۔
چراغ پا ہونا	خفا ہونا۔ غصہ ہونا۔
چیونٹی کے پر نکلنا	کمزور کا بہادری دکھانا۔ موت کے دن قریب ہونا
حاتم کے قبر پر لات مارنا	زیادہ سخی ہونا۔
حلقہ بگوش ہونا	غلام ہونا۔
خواب خرگوش میں ہونا	غفلت میں ہونا۔
خاک میں ملنا	تباہ و برباد ہوجانا۔
خاک ڈالنا	بات کو درگذر کرنا۔ بھلا دینا۔
داغ لگانا	بدنام کرنا۔
دال گلنا	بات بننا۔ کام پورا ہونا۔
دانت پیسنا	غصہ ہونا۔
دانت کھٹے کرنا	شکست دینا۔
دل بھر آنا	رونے کے قریب ہونا۔
داغ اٹھانا	صدمہ اٹھانا۔
دال میں کالا ہونا	کسی طرح کا شک ہونا۔
دل سے اترنا	نفرت ہوجانا۔

مطلب	محاورات
خوشی منانا۔	رنگ رلیاں منانا
غرور ہونا۔	زمین پر پاؤں نہ رکھنا
غم کو زیادہ کر دینا۔	زخم پر نمک چھڑکنا
منھ لگانا۔	سر چڑھانا
ہمدردی کرنا۔ مدد کرنا۔	سر پر ہاتھ رکھنا
مرنے کو تیار ہونا۔	سر بکف ہونا
ماتم کرنا۔	سر پر خاک اڑانا
خوبی میں اور اضافہ ہو جانا۔	سونے پر سہاگہ
مصیبت میں پھنسنا۔	ستارہ گردش میں ہونا
بغاوت کرنا۔ شرارت پر آمادہ ہونا۔	سر اٹھانا
فتح پانا۔	سر کرنا
بہت عزت کرنا۔	سر کے بل چلنا
کامیابی حاصل کرنا۔	سر سہرا ہونا
کسی سوچ میں پڑنا۔ حیران ہونا۔	ششش و پنج میں ہونا
گہری دوستی ہونا۔	شیر و شکر ہونا
بے مروتی کرنا۔	طوطا چشمی کرنا
بہت مغرور ہونا۔	عرش پر دماغ ہونا
تعجّب کرنا۔	عش عش کرنا
کوئی انوکھا کام کرنا۔	عرش کے تارے توڑنا
ہوش میں آنا۔	عقل کے ناخن لینا
کند ذہن ہونا۔	عقل پر پتھر پڑنا

محاورات	مطلب
عقل پر پردہ پڑنا	بیوقوف ہونا۔
قافیہ تنگ کرنا	پریشان کرنا۔
قارورہ ملنا	ہم خیال ہونا۔
کلنک کا ٹیکہ لگنا	بدنامی ہونا۔
کان پر جوں نہ رینگنا	کوئی اثر نہ ہونا۔
کتّے کی موت مرنا	ذلّت کی موت مرنا۔
کانٹے بونا	بُرا چاہنا۔
گیہوں کے ساتھ گھُن پسنا	مجرم کے ساتھ بے گناہ کا پکڑا جانا۔
لکیر کا فقیر ہونا	پرانی بات پر قائم رہنا۔
لوہا ماننا	ہار تسلیم کر لینا۔
منہ بھر دینا	رشوت دینا۔
نام کا سکّہ جاری ہونا	سب پر رعب غالب ہونا۔
نشہ ہرن ہونا	ہوش میں آجانا۔
ناک پر مکھّی نہ بیٹھنے دینا	کسی کے رعب میں نہ آنا۔
نیا شگوفہ چھوڑنا	عجیب بات کرنا۔
وارے نیارے ہونا	خوب فائدہ اٹھانا۔ مالدار ہونا۔
وبالِ جان ہونا	تکلیف دہ ہونا۔
ہُو کا عالم ہونا	سنسان اور خوفناک جگہ۔
ہاتھ بٹانا	کام میں مدد کرنا۔
یاد اللہ ہونا	جان پہچان ہونا۔

ضرب المثل کی تعریف اور اس کا پس منظر

ضرب المثل کو کہاوت بھی کہتے ہیں۔ یہ عرصہ دراز کے تجربات کی بنیاد پر بنے ہوئے وہ مخصوص جملے ہوتے ہیں جو بار بار کسی خاص موقع پر دانشوروں اور تجربہ کار لوگوں کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ اہل زبان نے انھیں ادبی شکل دے کر اپنی تحریر و تقریر میں استعمال کیا۔ اس طرح سیکڑوں کہاوتیں نہ صرف ہماری زبان کا سرمایہ بن گئیں بلکہ ہزاروں لاکھوں افراد کی زبان زد ہو گئیں۔ "بار بار کی کہی ہوئی بات" کی مناسبت سے شاید اس کا نام "کہاوت" پڑ گیا۔

دیگر زبانوں کی طرح اردو کی کہاوتیں بھی اس کا لسانی سرمایہ ہیں جو روزمرّہ کی گفتگو کو چٹپٹا بنانے میں کافی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ادبی اصطلاحات کی طرح نہ تو کہاوتیں گھڑی یا بنائی جاتی ہیں اور نہ ہی وقت کے ساتھ ساتھ ان میں کوئی ترمیم و تنسیخ ہوتی ہے۔ یہ اپنی لفظی بناوٹ، تاریخی پس منظر اور سچائی کے اس مفہوم اور پیغام کے ساتھ ہمیشہ قائم رہتی ہیں جو دوسروں تک ہمیں پہنچانا ہے یا جن کا سہارا لے کر ہمیں اپنے دل کی بات کہنی ہے۔ اردو زبان میں سیکڑوں کہاوتیں ایسی ہیں جو ہمیں کبھی سخت کلامی اور طویل گفتگو سے بچا لیتی ہیں۔ ان کا سہارا لے کر ہم وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جن کو سیدھے سادے لفظوں میں کہنے کی شاید ہم میں ہمت نہ ہو۔

"ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا"۔ "بڑھیا کے مرنے کا غم نہیں فرشتوں نے گھر دیکھ لیا"۔ "نو سو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی"۔ "پڑھے نہ لکھے نام محمّد فاضل"۔ "ایک تو کریلا وہ بھی نیم چڑھا"۔ وغیرہ۔ ایک تو کریلا کڑوا پھر نیم چڑھا

روزمرّہ کی طرح ضرب الامثال کے الفاظ اور ان کی ترتیب میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی ان کو جوں کا توں استعمال کرنا ضروری ہے۔ روزمرّہ اور

کہاوتوں میں دوسری یکسانیت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ دونوں قواعد اردو کی بندشوں سے آزاد ہیں ۔ ہر کہاوت کے پیچھے کوئی نہ کوئی تاریخی، تہذیبی یا سماجی واقعہ پوشیدہ ہوتا ہے طوالت کے خیال سے یہاں کسی ایسے واقعہ یا سماجی پس منظر کا ذکر نہ کر کے صرف دو چار ایسی کہاوتوں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جن کے پسِ منظر کے متعلق عام طور پر لوگ جانتے ہیں ۔

(۱) ابھی دلی دور ہے ۔ (۲) گربہ کشتن روزِ اوّل (۳) انگور کھٹے ہیں (۴) جیسی کرنی ویسی بھرنی وغیرہ ۔

ضرب الامثال (کہاوتوں) میں جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ اپنے حقیقی معنیٰ سے ہٹ کر بالکل دوسرے معنیٰ (مجازی) میں مفہوم کو پیش کرتے ہیں کہاوتوں کا برمحل استعمال نہ صرف ہمارے مقصد و مفہوم کو ادا کرتا ہے بلکہ لطفِ بیان کو بھی بڑھا دیتا ہے۔ بڑی سے بڑی بات کو کہاوتوں کی آڑ لے کر ہنستے ہنستے اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ پھر مخاطب کو کچھ کہنے کے لئے الفاظ نہیں ملتے ۔ مثلاً آپ کا کوئی جاننے والا کچھ روپے بطور قرض مانگتا ہے اور آپ اسے دینا نہیں چاہتے ایسی صورت میں کسی طرح کی دل خراش بات یا لمبی چوڑی صفائی دینے کے بجائے اُس سے صرف یہ کہہ دیجئے 'یار! چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں'۔

محاورے اور کہاوتوں میں فرق :۔

۱۔ بیشتر محاورے کسی نہ کسی مصدر سے بنتے ہیں جس کی علامت "نا" ہے مثلاً انگوٹھا دکھانا، "شیشے میں اتارنا" وغیرہ جب کہ کہاوتوں کے لئے کسی مصدر کی علامت "نا" یا اس سے مشتق ہونا ضروری نہیں ہے ۔

۲۔ مفہوم یا مقصد کی ادیگی کے اعتبار سے کہاوتوں میں محاوروں کے مقابلے زیادہ وسعت ہوتی ہے کیونکہ ان کے پیچھے کوئی نہ کوئی فرضی حکایت، تاریخی واقعہ، مذہبی عقیدہ یا سماجی طور طریقوں کی کچھ قدریں پوشیدہ ہوتی ہیں ۔

۳۔ کہاوت کے الفاظ کی تعداد بمقابلہ محاورہ زیادہ ہوتی ہے بلکہ بہت سی کہاوتیں تو ایسی بھی ہیں جن کی عبارت مقفیٰ یا شعری تک بندی کے انداز پر ہیں مثلاً :۔ "پھول نہ پان' کہنے کو مہمان"۔(۱۱) دلی کی بیٹی، متھرا کی گائے ' کرم پھوٹے تو باہر جائے"۔

۴۔ محاورہ مکمل جملہ نہیں ہوتا، وہ مزید کچھ جملوں یا عبارت کا محتاج ہوتا ہے ان کے بغیر وہ اپنا مفہوم واضح نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس کہاوت یا ضرب المثل پورا جملہ ہوتا ہے جو دوسری عبارت کے بغیر اپنا پورا پورا مفہوم ادا کرتا ہے جیسے "دمڑی کی ہانڈی گئی کتے کی ذات پہچانی گئی" یعنی غنیمت ہے کہ تھوڑے سے ہی نقصان کے بعد ذلیل اور کمینے شخص کی اصلیت واضح ہو گئی۔ "آنکھ کھلنا" محاورہ ہے جس کے معنی ہیں "غفلت سے بیدار ہونا" یا چوکنا ہونا۔ لیکن یہ محاورہ جب تک جملے میں استعمال نہ کیا جائے مذکورہ بالا مفہوم کو ادا نہیں کرتا مثلاً "تمہارے دوستوں نے تم کو کئی بار دھوکا دیا تعجب ہے اب بھی تمہاری آنکھ نہیں کھلی"۔

اگر یہاں صرف یہ کہا جاتا کہ "آنکھ نہیں کھلی" تو یہ مصدر اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہو کر محاورہ کی شرط کو پورا نہیں کرتا۔ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ محاورے جملوں میں استعمال ہو کر ہی اپنے مفہوم کو ادا کرتے ہیں جب کہ ضرب الامثال تنہا اپنے مفہوم کی ادائیگی کے لئے کافی ہیں۔

مذکورہ بالا فرق کے باوجود محاورے اور کہاوتیں کچھ باتوں میں ایک دوسرے کے قریب بھی ہیں جیسے :۔

۱۔ کہاوتوں کی طرح بیشتر محاوروں کا بھی کوئی نہ کوئی پس منظر ہوتا ہے۔

۲۔ محاورہ اور ضرب المثل دونوں میں کسی طرح کی لفظی تبدیلی نہیں کی جا سکتی سوائے اس کے کہ محاورہ کو جملوں میں استعمال کرتے وقت مصدر کی علامت "نا" کو فعل میں بدل دیتے ہیں۔

ان دونوں کے فرق اور یکسانیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ محاورہ اور کہاوت میں بہت بڑا فرق نہیں ہے اسی لئے کچھ محاورے کبھی کبھی غلطی سے کہاوتوں

میں شمار کر لئے جاتے ہیں۔

ماہرینِ اردو نے محاوروں کی طرح کہاوتوں کو بھی چیزوں کے نام اور اس کے ذکر کے اعتبار سے مختلف خانوں میں تقسیم کیا ہے مثلاً :۔

۱۔ حیوانی کہاوتیں = "طویلے کی بلا بندر کے سر"۔ "اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہوتا ہے"۔ "اونٹ کے منہ میں زیرہ" وغیرہ

۲۔ نباتاتی کہاوتیں = "ایک تو کریلا دوسرے نیم چڑھا"۔ "آم کے آم گٹھلیوں کے دام"۔ "الٹے بانس بریلی کو" وغیرہ

۳۔ اعضائی کہاوتیں = "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل"۔ "جنم کے اندھے نام نین سکھ"۔

۴۔ فلکیاتی اور موسمی کہاوتیں = "آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا"۔ "جب چاند چڑھے گا سب دیکھیں گے"۔

۵۔ عددی کہاوتیں = "ایک ڈاڑھ چلے ستر بلا ٹلے"۔ "نو سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی"۔ "حساب جو جو بخشش سو سو"۔

۶۔ خورد و نوشی کہاوتیں = "تھوتھا چنا باجے گھنا"۔ "اپنی چھاچ کو کون کھٹا کہتا ہے"۔ "گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے"۔

۷۔ اخلاقی کہاوتیں = "خدمت سے عظمت ہے"۔ "سانچ کو آنچ نہیں"۔ "تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے"۔ وغیرہ

۸۔ سماجی یا رسمی کہاوتیں = "آپ ہارے بہو کو مارے"۔ "پیسا گانٹھ کا یار ساتھ کا"۔ "بڈھی گھوڑی لال لگام"۔ "غریب کی جورو سب کی بھابی"۔ وغیرہ۔

۹۔ پیشہ ورانہ کہاوتیں = "دھوبی کا چھیلا ایک اجلا ایک میلا"۔ "حلوائی کی دوکان دادا جی کی فاتحہ"۔ "تیلی کا تیل جلے مشعلچی کی چھاتی پھٹے"۔ "سو سنار کی ایک لوہار کی"۔ وغیرہ۔

ضربُ الامثال (کہاوتیں)

ضرب المثل	مفہوم
آپ کاج مہا کاج	اپنا کام خود کرنے میں زیادہ بہتری ہے۔
آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا	بیوقوف امیر۔
اونچی دوکان پھیکا پکوان	صرف شہرت ہی شہرت، اصلیت کچھ بھی نہیں۔
آدھا تیتر آدھا بٹیر	کسی ایسے جوڑ کو لگانا جو میل نہ کھاتا ہو۔
اب پچھتائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت	وقت گزرنے کے بعد افسوس کرنا بے کار ہے۔
اُسی کی جوتی اسی کا سر	جو جیسا کرے گا ویسا بھگتے گا۔
الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے	خود غلطی پر ہو مگر دوسرے پر رعب جمائے۔
ایک پنتھ دو کاج	ایک کام کے ساتھ کئی کام نکالنا۔
ایک تو کریلا دوسرے نیم چڑھا	پہلے ہی بگڑا ہوا تھا مزید یہ کہ بُروں کی صحبت مل گئی۔
ایک ہاتھ تالی نہیں بجتی	لڑائی میں دونوں طرف سے کچھ نہ کچھ زیادتی رہتی ہے۔
اندھیر نگری چوپٹ راج	اس موقع پر بولتے ہیں جب حد درجہ بدانتظامی ہو۔
آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل	سارے وعدے اور محبت اسی وقت تک ہے جب تک آدمی نظر کے سامنے ہے۔
آم کے آم گٹھلیوں کے دام	ایک چیز سے دہرا فائدہ اٹھانا۔
اونٹ کے منہ میں زیرا	ضرورت کے لحاظ سے بہت کم ملنا۔
ایک انڈا وہ بھی گندہ۔	ایک ہی بیٹا وہ بھی نالائق۔
اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مارنا	جان بوجھ کر اپنا نقصان آپ کرنا۔

ضرب المثل	مفہوم
باسی کڑھی میں ابال آنا	بہت دیر سے کسی کام کا یاد آنا۔
بوڑھی گھوڑی لال لگام	عمر گذر جانے کے بعد آرائش کرنا۔
بھری جوانی مانجھا ڈھیلا	جوانی کے زمانہ میں سستی دکھانا۔
بھینس کے آگے بین بجانا	بیوقوفوں کے سامنے عالمانہ باتیں کرنا بے سود ہے۔
بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی	برا آدمی اپنے کئے کی سزا سے بچ نہیں سکتا۔
بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی	جو مل جائے وہی غنیمت ہے۔
بندر کے ہاتھ ناریل۔	اناڑی کے ہاتھ میں جس چیز کا محفوظ رہنا مشکل ہو۔
بن مانگے موتی ملے مانگے ملے نہ بھیک۔	جو مقدر میں ہوتا ہے مل کر رہتا ہے۔ انسان کو حریص نہیں ہونا چاہیئے۔
بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔	جس کام میں کامیابی کی توقع نہ ہو اور اتفاق سے کسی بہانے کامیابی حاصل ہو جائے۔
پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل	جاہل جو اپنے کو بہت بڑا قابل اور عالم ظاہر کرتا ہے۔
تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو	جیسا موقع آئے اسی کے مطابق کام کرو۔ جلدی نہ کرو۔
تولہ بھر کی آرسی نانی بولے فارسی۔	تھوڑا سا احسان کر کے اس کو بار بار جتانا۔
تھوتھا چنا باجے گھنا۔	کم ظرف آدمی شیخی زیادہ مارتا ہے۔
تو بھی رانی میں بھی رانی، کون بھرے گا پانی۔	جب سب ہی اپنے کو امیر یا نازک سمجھنے لگیں گے تو پھر کام کون کرے گا۔
ٹکے کی بڑھیا نو ٹکے سر منڈھائی۔	تھوڑے سے فائدے کے لئے زیادہ خرچ کرنے پر تیار ہونا
جڑ سے بیر پتوں سے یاری۔	بزرگوں سے دشمنی اور ان کی اولاد سے یاری۔
جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔	مجرم اپنی بات سے ہی پکڑا جاتا ہے۔

ضرب المثل	مفہوم
جان نہ پہچان خالہ بی بی سلام	کسی معاملہ میں خواہ مخواہ کسی کا دخل دینا۔
جس کی لاٹھی اس کی بھینس	طاقتور کا سب کچھ ہے۔
جس ہانڈی میں کھانا اسی میں چھید کرنا	اپنے مالک کے ساتھ نمک حرامی کرنا۔
جو گرجتا ہے برستا نہیں	ڈینگیں مارنے والا صرف باتیں کرتا ہے کام نہیں۔
جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا	جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو وہ تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہے۔
جس کے نہ پھٹی ہو بوائی وہ کیا جانے پرائی پیر	جس تکلیف سے آدمی کو واسطہ نہ پڑا ہو وہ دوسروں کی تکلیف کا اندازہ نہیں کر سکتا۔
جس راہ نہ چلنا اس کے کوس کیا گننا	جس معاملہ سے ہمارا تعلق نہ ہو اس کی فکر کیا کرنا۔
جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا	کمال وہاں دکھائے جہاں سب موجود ہوں۔
چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل	کسی نااہل کو بڑا مرتبہ مل جانے کے موقع پر بولتے ہیں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں	فضول خرچ کرنے والوں کے پاس پیسے نہیں بچتے۔
چور کی داڑھی میں تنکا	قصوروار کو ہر بات سے اپنا شک گزرتا ہے۔
چھوٹا گھر بڑا اسمد ھیانہ	اس موقع پر بولتے ہیں جب معمولی حیثیت کا آدمی ڈینگیں مارتا ہے۔
چونی بھی کہے مجھے گھی سے کھاؤ	معمولی آدمی کا کسی بڑے آدمی کے برابر ہونے کا دعویٰ کرنا۔
چور چوری سے گیا تو کیا ایرا پھیری سے گیا	بری عادت چھوڑنے کے باوجود بھی کچھ نہ کچھ اثر باقی رہتا ہے۔

ضرب المثل	مفہوم
حوض بھرے فوارہ چھوٹے	آمدنی ہونے پر ہی خرچ کیا جا سکتا ہے۔
حلوائی کی دوکان، داداجی کی فاتحہ	پرائے مال کو خرچ کر کے سخی بننا۔
حساب جو جو بخشش سو سو	حساب صاف رکھنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے
خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی	ظالم خدا کے عتاب سے بچ نہیں سکتا۔
خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے	صحبت کا اثر ضرور پڑتا ہے۔
خس کم جہاں پاک	بُرے آدمی کا مر جانا ہی اچھا ہے۔
دبی بلی چوہوں سے کان کٹواتی ہے	مطلب پر گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔
دریا کو کوزہ میں بند کرنا	لمبے مضمون کو بہت مختصر لفظوں میں بیان کر دینا۔
دس کی لاٹھی ایک کا بوجھ	میل ملاپ سے رہنے میں برکت ہے۔
دمڑی کی بڑھیا ٹکا سر منڈائی	کام تھوڑا مزدوری زیادہ۔
دمڑی کی ہانڈی گئی کتے کی ذات پہچانی گئی۔	تھوڑے سے ہی نقصان کے بعد کمینے آدمی کی پہچان ہو گئی۔
دودھ کا دودھ پانی کا پانی	پورا پورا انصاف ہونا۔
دور کے ڈھول سہانے	دور کی ہر چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔
دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا	دونوں فریق سے چپکے چپکے ملنے والا ایک روز ذلیل ہو جاتا ہے۔
دیوار بھی کان رکھتی ہے۔	راز کی بات کو بہت ہوشیاری سے کہنا چاہیئے۔
دریا میں رہنا مگر مچھ سے بیر	جس کے ساتھ ہر وقت اٹھنا بیٹھنا ہو اس سے دشمنی اچھی نہیں۔
دیکھا نہ بھالا صدقہ گئی خالہ	بغیر دیکھے ہوئے کسی چیز کی تعریف کرنا۔
ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا	سب سے الگ ہو کر اپنی رائے قائم کرنا۔

ضرب المثل	مفہوم
رام رام جپنا پرایا مال اپنا	ظاہر میں نیک باطن میں شیطان۔
رسی جل گئی پر بل نہیں گیا۔	وقت نے حالت خراب کردی مگر شان پہلے جیسی ہے۔
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔	جس بات کو سب لوگ کہہ رہے ہوں وہ ضرور سچ ہوگی۔
سانجھے کی ہانڈی چوراہے پر پھوٹتی ہے	شرکت کے کام میں برائی آتی ہے۔
سخی سے سوم بھلا جو ترت دے جواب	دل خوش کرنے والے وعدوں پر کسی کو مسلسل انتظار میں رکھنا اچھا نہیں ہے۔
ساون ہرے نہ بھادوں سوکھے	وہ شخص جس کی حالت ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہو
سارے شہر میں اونٹ بدنام	بدا اچھا بدنام برا۔
طویلے کی بلا بندر کے سر	ایک کی مصیبت دوسرے کے ذمہ ڈالنا۔
قبل از مرگ واویلا	کسی آفت کے آنے سے پہلے ہی ہنگامہ کھڑا کر دینا۔
قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے۔	چالاک آدمی کی اولاد بھی چالاک ہوتی ہے۔
کاٹھ کی ہانڈی بار بار نہیں چڑھتی۔	کسی کے ساتھ دھوکہ یا فریب بہت دنوں تک نہیں چلتا۔
کوئلے کی دلالی میں ہاتھ کالے	برے کام کا برا انجام ہوتا ہے۔
کیا ننگی نہائے کیا نچوڑے۔	سخت مفلسی کی حالت میں ہونا۔
کھایا منھ نہائے بال نہیں چھپتے	کسی کی خوشحالی اور بدحالی پوشیدہ نہیں رہتی۔
گال والا جیتے مال والا ہارے۔	بدزبان کے آگے کوئی جیت نہیں سکتا۔
گاؤں کا جوگی جوگنا آن گاؤں کا سدھ	وطن سے باہر نکل کر ہی عزت ہوتی ہے۔
گھر کی مرغی دال برابر۔	گھر کی چیز کے مقابلہ میں باہر کی چیز کی قدر ہوتی ہے۔

ضرب المثل	مفہوم
گھر گھوڑا نخاس مول	جو چیز جہاں موجود نہ ہو اس کا مول کرنا بے کار ہے۔
گھڑی میں گھڑیال ہے	وقت کا کچھ ٹھیک نہیں۔ ذرا دیر میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے
گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔	گھر کا راز دینے والا بڑی مصیبتیں کھڑی کر دیتا ہے۔
لنگوٹی میں پھاگ کھیلنا۔	مفلسی میں رنگ رلیاں منانا۔
منہ لگائی ڈومنی گائے تال بے تال	حقیر شخص کے ساتھ اگر تھوڑی سی بھی بے تکلفی برتی جائے تو پھر وہ سر چڑھ جاتا ہے۔
من چنگا تو کٹھوتی میں گنگا۔	صاف دل اور سچے اعتقاد کے لئے ہر جگہ خدا ہے۔
مالِ عرب پیشِ عرب ۔	بہتر ہے کہ اپنا مال اپنے ہی سامنے ہو۔
مول سے بیاج پیارا ہے ۔	پوتے اور پوتیاں بیٹوں سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔
نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔	نہ اتنی بڑی شرط پوری ہوگی نہ یہ کام ہوگا۔
نہ باسی بچے نہ کتے کھائیں۔	چیز اسی وقت ضائع ہوتی ہے جب ضرورت سے زائد ہوتی ہے۔
ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی اسی کا ناؤں۔	جس کی جو چیز ہوتی ہے اسی کے نام ہر جگہ مشہور ہوتی ہے۔
ہاتھ سمرنی بغل کترنی	منہ پر رام رام بغل میں چھری۔
ہنوز دلی دور است	ابھی مقصد پورا ہونے میں دیر ہے۔
ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ۔	ذہین بچے ابتدا ہی سے اپنا رنگ دکھانے لگتے ہیں۔
ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور۔	ظاہر اور باطن میں فرق ہونا (گندم نما جو فروش)

ضرب المثل	مفہوم
ہاتھی نکل گیا دم باقی ہے	کام کا بڑا حصّہ تو انجام پا گیا مگر تھوڑا سا کام اٹک کر رہ گیا۔
ہرّے لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے	بغیر کچھ خرچ کئے یہ امید رکھنا کہ کام بہتر سے بہتر ہو۔
ہمچو من دیگرے نیست ۔	میرے جیسا کوئی دوسرا نہیں یعنی خود ستائی کرنا۔
ہماری بلی ہمیں سے میاؤں ۔	ہمارے ہی احسان تلے دبے ہو اور ہمیں پر غصّہ دکھاتے ہو
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ۔	جو چیز ظاہر ہے اس کو دکھانے کی کیا ضرورت ۔
ہونٹوں نکلی کوٹھوں پہنچی ۔	مشتہر ہونا۔
یہ منھ اور مسور کی دال ۔	اپنی اوقات سے زیادہ کسی اعلا چیز کی خواہش کرنا۔
یہ وہ گڑ نہیں جو چیونٹے کھائیں۔	بخیل یا ایسے بے فیض شخص کے لئے کہتے ہیں جس کی ذات سے کسی کو کوئی فائدہ پہنچنے کی امید نہیں ہوتی ۔
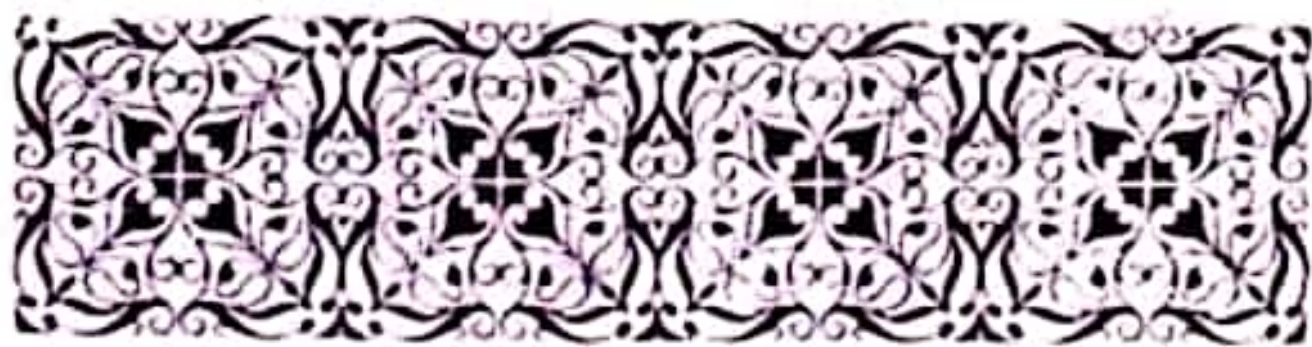
اسم فاعل، اسم مفعول اور ان کے اوزان

اسم فاعل اور اسم مفعول کی تعریف اور ان کی مثالیں اس کتاب کے حصۂ اوّل میں پہلے لکھی جا چکی ہیں۔ یہاں پر ہم عربی کے چند اوزان کا ذکر کریں گے جن کے اصول پر اسم فاعل اور اسم مفعول بنائے جاتے ہیں۔ عربی زبان میں اسم فاعل اور اسم مفعول بنانے کے کچھ قاعدے ہیں جنھیں ہم "اوزان" کہتے ہیں۔ عربی زبان کے بہت سے الفاظ جو اردو میں شامل ہو گئے ہیں اور عام بول چال میں استعمال بھی ہوتے ہیں اُن کو اِنہیں اوزان کے تحت اسم فاعل اور اسم مفعول میں تبدیل کیا گیا ہے۔

اسم فاعل اور اسم مفعول کے کچھ اوزان حسب ذیل ہیں۔ ان اوزان پر بننے والے اسم فاعل اور اسم مفعول کی یہاں ایک ایک مثال دی گئی ہے۔ اِن اوزان پر اسم فاعل اور ان کے اصول کے متعلق تفصیل سے آگے بیان کیا جائے گا۔

اوزان اسم فاعل	اوزان اسم مفعول
۱۔ فَاعِلْ ــــ نَاصِرْ	مَفْعُوْلْ ــــ مَنْصُوْر
۲۔ مُفْعِلْ ــــ مُرْسِلْ	مُفْعَلْ ــــ مُرْسَلْ
۳۔ مُفْتَعِلْ ــــ مُنْتَظِرْ	مُفْتَعَلْ ــــ مُنْتَظَرْ
۴۔ مُفَعِّلْ ــــ مُصَوِّرْ	مُفَعَّلْ ــــ مُصَوَّرْ
۵۔ مُتَفَعِّلْ ــــ مُتَضَرِّرْ	مُتَفَعَّلْ ــــ مُتَضَرَّرْ
۶۔ مُفَاعِلْ ــــ مُخَاطِبْ	مُفَاعَلْ ــــ مُخَاطَبْ
۷۔ مُتَفَاعِلْ ــــ مُتَصَادِمْ	مُتَفَاعَلْ ــــ مُتَصَادَمْ

مذکورہ بالا اوزان پر اسم فاعل اور اسم مفعول کی مثالوں کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ ایک ہی لفظ زیر زبر کے فرق سے اسم فاعل یا اسم مفعول بن جاتا ہے۔ جیسے مخاطِب (اسم فاعل) مخاطَب (اسم مفعول)۔ اسی طرح مذکورہ اوزان پر بہت سے اسم فاعل ایسے ہیں جن کا تیسرا چوتھا یا پانچواں حرف مکسور ہے لیکن جب انہیں پر "زبر" لگ جاتا ہے تو وہ اسم مفعول ہو جاتے ہیں۔ صرف "مُفَعَّل" کے وزن پر جس کا پہلا حرف مضموم اور تیسرا مشدّد ہوتا ہے جس کو زیر کے ساتھ پڑھا جائے تو اسم فاعل اسی کو "زبر" کے ساتھ پڑھا جائے تو اسم مفعول ہو جاتا ہے جیسے :-

مُفَعِّل (وزن)		مُفَعَّل (وزن)		تفعیل (وزن)
اسم فاعل	معنیٰ	اسم مفعول	معنیٰ	حاصل مصدر
مُہذِّب	عیبوں سے پاک کرنے والا	مُہذَّب	عیبوں سے پاک کیا گیا	تہذیب
مُعلِّم	تعلیم دینے والا	مُعلَّم	جس کو تعلیم دی گئی	تعلیم
مُعذِّب	عذاب کرنے والا	مُعذَّب	عذاب کیا گیا	تعذیب
مُصنِّف	تصنیف کرنے والا	مُصنَّف	تصنیف کیا گیا	تصنیف
مُحرِّر	تحریر کرنے والا	مُحرَّر	تحریر کیا گیا	تحریر
مُرتِّب	ترتیب دینے والا	مُرتَّب	ترتیب دیا گیا	ترتیب
مُزیِّن	آراستہ کرنے والا	مُزیَّن	زینت دی گئی	تزئین
مُدبِّر	تدبیر کرنے والا	مُدبَّر	تدبیر کی گئی	تدبیر
مُترجِم	ترجمہ کرنے والا	مُترجَم	ترجمہ کیا گیا	ترجمہ
مُعجِّل	جلدی کرنے والا	مُعجَّل	جلدی کیا گیا۔ بے مہلت	تعجیل
مُکمِّل	کام پورا کرنے والا	مُکمَّل	کام پورا کیا گیا	تکمیل
مُحقِّق	تحقیق کرنے والا	مُحقَّق	تحقیق کیا گیا	تحقیق

مذکورہ بالا مثالوں کے ذریعہ یہ بات واضح ہو گئی کہ ایک ہی لفظ مختلف اعراب کے ساتھ مختلف معنی رکھتا ہے اور مذکورہ اوزان کے مطابق آخری حرف کو زیر کے بجائے زبر کے ساتھ پڑھنے پر بہت سے اسم فاعل اسم مفعول میں بدل جاتے ہیں۔ اردو کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے اس طرح کے الفاظ کا ہمیں علم ہونا چاہئے ورنہ اسی طرح کی غلطیوں کے ہونے کا امکان ہے جو اکثر پڑھے لکھے لوگوں سے ذیل کے اشعار میں ہو جاتی ہیں :۔ ؎

دلی کے نہ تھے کوچے، اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی
(میرؔ)

؎ کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں
(اقبالؔ)

پہلے شعر میں اگر اس کو "اوراقِ مصوِّر" پڑھا جائے جیسا کہ کچھ لوگ اس کو فاعل سمجھ کر "مصوِّر" ہی پڑھتے ہیں تو ایسی صورت میں یہ مرکبِ اضافی ہوگا۔ (اوراق۔ مضاف) (مصوِّر۔ مضاف الیہ) یعنی مصوِّر کے اوراق، جس کے معنی ہوئے "وہ اوراق جو کسی مصوِّر کی ملکیت ہوں"۔

اگر لفظ "مصوّر" کو زبر کے ساتھ یعنی "مُصَوَّر" پڑھا جائے تو وہ مذکورہ وزن "مُفَعَّل" کے مطابق اسم مفعول بن جائے گا۔ ایسی صورت میں "اوراقِ مُصَوَّر" مرکب توصیفی کہلائے گا۔ (اوراق۔ موصوف) (مُصَوَّر۔ صفت) اب اس کے معنی ہوئے وہ اوراق جن پر تصویریں کھینچی ہوئی ہوں، یعنی البم۔ میرؔ کے اس شعر میں یہی معنی مراد ہیں۔ شعر کا مفہوم اسی وقت درست ہوگا جب اِس کو اوراقِ مُصَوَّر پڑھا جائے۔

مطلب :۔ دلی کی گلیوں اور کوچوں سے میرؔ کو بے انتہا لگاؤ اور اُنس تھا جن کو انھوں نے اوراقِ مُصَوَّر سے تشبیہ دی ہے۔ دلی کی گلیوں کی خوبصورت اور دل فریب شکلیں اس کی وجہِ تشبیہ ہیں۔ جس طرح کسی مصوِّر کا البم طرح طرح کی خوبصورت تصویروں کا مجموعہ ہوتا ہے اسی طرح دلی کی گلیاں اور کوچے حسینوں کی دم سے بارونق تھے۔

اگر غلطی سے اسے "اَوراقِ مُصوّر" پڑھا جائے تو نہ صرف اس کے معنی بدل جائیں گے بلکہ پورے شعر کا مطلب بھی غلط ہو جائے گا۔ موقع کے لحاظ سے الفاظ کو صحیح اعراب کے ساتھ نہ پڑھنے کی دوسری مثال ہمیں کبھی کبھی اقبالؔ کے مذکورہ بالا شعر سے ملتی ہے۔ یہاں بھی اسم فاعل کی حیثیت سے "مُنتظِر" نہ پڑھ کر اسم مفعول کی حیثیت سے "مُنتظَر" ہی پڑھنا درست ہوگا۔ اس طرح "حقیقتِ منتظَر" کے معنی نکلیں گے۔ وہ ذاتِ برحق جس کا شدت سے انتظار کیا جا رہا ہے۔ اگر اس کو "مُنتظِر" پڑھا جائے تو شعر کا سارا مطلب ہی غلط اور بے معنی ہو جائے گا۔

اسم فاعل بنانے کے سلسلہ میں عربی زبان کے کچھ اوزان کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے طلبہ کی واقفیت کے خیال سے انھیں اوزان پر بنے ہوئے اسم فاعل کی کچھ ایسی مثالیں یہاں تحریر کی جا رہی ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں :۔

اسم فاعل اوران کے اوزان :۔

فاعِل ـــــ ناصِر، خاتِم، عابِد، خالِق، زاہِد، قاصِد، ظالِم، حاسِد، عاشِق، عالِم، شاکِر، قادِر، ناشِر، شاطِر، عامِل، شامِل، عادِل، فاعِل، ناقِل، غافِل، جاہِل، عاقِل، کامِل، باطِل، حائِل، سائِل، قائِل، طالِب، غالِب، غاصِب، کاشِف، کاتِب، حادِث، طابِع، شافِع، قانِع، قاضِی، عاصِی، ساقی وغیرہ (اس وزن پر اسم فاعل کے پہلے حرف کے بعد "الف" اور تیسرا حرف مکسور یعنی "زیر" کے ساتھ ہوتا ہے)

مُفعِل ـــــ (پہلا حرف مضموم اور تیسرا حرف مکسور ہوتا ہے) مُرسِل، مُنکِر، مُجرِم، مُخبِر، مُرشِد، مُفلِس، مُخلِص، مُشفِق، مُحسِن، مُونِس، مُہلِک، مُمسِک، مُلحِد، مُصلِح، مُسرِف، مُقبِل وغیرہ۔

مُفتَعِل ـــــ (آپ دیکھیں گے کہ اس وزن پر آئے ہوئے لفظ کا پہلا حرف مضموم تیسرا مفتوح یعنی زبر لگا ہوا اور چوتھا مکسور ہوتا ہے یا اس کے بعد "ی" آتی ہے) مثلاً:۔ مُنتظِر، مُضطرِب، مُقتدِر، مُنکسِر، مُنتشِر، مُحترِز، مُستقِل، مُندمِل، مُتصِل، مُختلِف، مُنکشِف،

مُنقلِب ، مُمتحِن ، مُنتظِم ، مُنتقِم ، مُبتدی ، مُنتہی ، مُدبّی ، مُقتدی وغیرہ ۔

مُفَعِّل ـــ (پہلا حرف مضموم ، دوسرا مفتوح اور تیسرا حرف مُشدّد ہوتا ہے جو آخر کے ساکن حرف کے ساتھ زیر سے پڑھا جاتا ہے ۔)

مُصوِّر ، مُورِّخ ، مُفرِّح ، مُفکِّر ، مُقرِّر ، مُفسِّر ، مُکبِّر ، مُدرِّس ، مُحدِّث ، مُصدِّق ، مُکلِّف ، مُنجِّم ، مُربّی ، مُغنّی ، مُقوّی وغیرہ (اس وزن کے بہت سے اسم فاعل پہلے بھی لکھے جاچکے ہیں)

مُتَفَعِّل ـــ (پہلا حرف مضموم اور چوتھا مُشدّد ہوتا جو اپنے اگلے حرف کے ساتھ زیر سے پڑھا جاتا ہے)

مُتکلِّم ، مُتعلِّم ، مُتشکِّل ، مُتحمِّل ، مُتبسِّم ، مُتعصِّب ، مُتعلِّق ، مُتغیِّر ، مُتحیِّر ، مُتشدِّد ، مُتعرِّض ، مُتوزِّی ، مُتجسِّس وغیرہ ۔

مُفاعِل ـــ (پہلا حرف مضموم ، دوسرا الف کے ساتھ اور چوتھا مکسور ہوتا ہے)

مُخاطِب ، مُخالِف ، مُحارِب ، مُناسِب ، مُحاسِب ، مُصاحِب ، مُقابِل ، مُجاہِد ، مُسافِر ، مُحاصِر ، مُعالِج ، مُطابِق ، مُدافِع وغیرہ ۔

مُتَفاعِل ـــ (پہلا حرف مضموم ، تیسرا حرف الف کے ساتھ اور پانچواں مکسور ہوتا ہے)

مُتصادِم ، مُتخاصِم ، مُتبادِل ، مُتماثِل ، مُترادِف ، مُتناقِض ، مُتساوی ، مُتوازی ، مُتلاشی ، وغیرہ ۔

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ اسم فاعل اور اسم مفعول کے بہت سے اوزان ہیں۔ ہم نے اُن میں سے چند کا ذکر کیا ہے ۔ ذیل کے الفاظ بھی اسم فاعل ہیں جو مختلف اوزان پر مشتمل ہیں ۔

(۱) خطیب ، ادیب ، شدید ، سعید ، شریر ، بشیر ، بصیر ، نصیر ، قدیر ، امین عقیل ، جمیل ، خلیل ، جلیل ، عظیم ، کریم ، علیم ، حکیم ، ندیم ، کلیم ، سمیع ، شفیع وغیرہ

(۲) مُدیر ، مُشیر ، مُرید ، مُفید ، مُقِر ، مُصِر ، مُحب ، مُجیب ، مُعین ، مُبین ، مقیم وغیرہ

نظم اور نظمِ جدید

"نظم" کے لغوی معنی "لڑی میں موتی پرونا" ہیں اصطلاحِ عام میں کسی چیز کی تنظیم، آرائش یا ترتیب دینے کو کہتے ہیں لیکن ادبی اصطلاح میں "نظم" سے مراد پوری شاعری ہوتی ہے جو "نثر" کے مدِ مقابل ہے۔ نظم میں سوائے غزل کے وہ تمام اصنافِ سخن شامل ہیں جن پر کلامِ موزوں ہونے کا اطلاق ہوتا ہے یا ہیئت کے اعتبار سے نثر نہیں ہیں لیکن دورِ قدیم میں نظمیں اپنی اپنی خصوصیات یا موضوعات کے باعث کچھ خاص اصناف کے نام سے موسوم ہو گئیں مثلاً قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی، اور قطعہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ خاص اسلوب کے تحت مصرعوں اور بندوں کو ترتیب دے کر نظمیں لکھی گئیں۔ جن کو مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند، مستزاد اور تضمین وغیرہ کا نام دیا گیا۔ اگرچہ یہ سب "نظم" ہیں مگر ان کو انہیں ناموں سے یاد کیا جاتا ہے جو ان کے لئے متعین کر دیئے گئے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ نظم شاعری کی وہ صنف ہے جس میں کسی خاص موضوع پر تسلسل کے ساتھ خیالات کا اظہار کیا گیا ہو۔ نظم کے لئے ایک مرکزی خیال کا ہونا ضروری ہے جس کا ارتقا نظم کے آخیر تک تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے۔

نظمِ جدید بدلتے ہوئے حالات کے تحت جیسے جیسے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تعلیمی تبدیلیاں ظہور میں آئیں ویسے ویسے نظم کے روایتی اسلوب اور موضوع میں بھی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ نظم کے اس نئے اسلوب کو "نظمِ جدید" کے نام سے یاد کیا گیا۔ گذشتہ سو سالوں میں نظمِ جدید کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جلد ہی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس میں زندگی کے موجودہ حالات، جذبات، مسائل اور احساسات کی آسان لفظوں میں سچی ترجمانی کی جاتی ہے۔ جدید نظم کی تعریف ڈاکٹر قمر رئیس نے اس طرح کی ہے۔ "فنی ساخت کے اعتبار سے نظمِ جدید وہ نظم کہی جائے گی جس میں شاعر

نے شاعری کی قدیم اصناف کے بندھے ٹکے ضابطوں کا پابند نہ رہ کر کسی مسلمہ اور مانوس یا نئی اور اچھوتی ہیئت میں اپنے تجربات اور خیالات کو ربط و تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہو۔"

نظم کے لئے کسی ہیئت یا موضوع کی قید نہیں ہے۔ کسی بھی ہیئت میں کوئی بھی موضوع نظم کا موضوع ہو سکتا ہے۔ نظم جدید کو ہیئت کے لحاظ سے تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

وہ نظم جس میں ہیئت کے اعتبار سے کچھ روایتی اصناف یا اسلوب کی پابندی کی گئی ہو لیکن اس میں بحر کے استعمال اور قافیوں کی ترتیب میں مقررہ اصولوں کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ ایسی نظم کو "پابند نظم" کہتے ہیں مثلاً مربع، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند، گیت اور دوہا وغیرہ۔

وہ نظم جو شروع سے آخر تک مصرعوں کے وزن کے تقاضوں کو تو پورا کرتی ہو یعنی مصرعے برابر ہوں مگر ردیف اور قافیوں کی پابندی سے آزاد ہو۔ ایسی نظموں کو "غیر مقفیٰ" یا "نظم معرّا" کہا جاتا ہے۔

وہ نظم جس میں وزن، قافیہ اور بحر کے روایتی اصولوں کی پابندی نہ کی گئی ہو یعنی ان سب پابندیوں سے جو نظم آزاد ہو اسے ہم "آزاد نظم" کہتے ہیں۔ اس کے مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں مگر اس میں بھی نئے اسلوب۔ کے تحت ایک خاص قسم کے شعری وزن کو برقرار رکھا جاتا ہے۔

نظم گو شعرا میں نظیر اکبرآبادی، محمد حسین آزاد، حالیؔ، اسمٰعیل میرٹھی، اقبالؔ، جوشؔ، احسان دانش، اختر شیرانی، مجازؔ، فیضؔ، جذبیؔ، سردار جعفری، جانثار اختر، ساحر لدھیانوی، اخترالایمان، اور میراجی کے نام قابل ذکر ہیں۔

اصنافِ سُخن (اقسامِ نظم)

نظم کے لغوی معنی "موتی پرونے" کے ہیں لیکن اصطلاح میں کلام موزوں کو کہتے ہیں۔ کلام موزوں سے مراد "شعر" ہے۔

شعر کی تعریف لفظ "شعر" "شعور" سے بنا ہے۔ یہ دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ شعر کے معنی ہیں جاننا یا واقفیت رکھنا۔ مگر اصطلاح میں سخن موزوں باقافیہ جو کہنے والے نے شعوری طور پر یعنی ارادہ کے ساتھ کہا ہو "شعر" کہلاتا ہے۔ شعر میں قافیہ اور وزن کا ہونا ضروری ہے۔

شعر کہنے والے کو "شاعر" اور اس کے کلام یا تخلیق کو "شاعری" کہتے ہیں۔ شاعری کی مختلف قسمیں ہیں جن کو "اصنافِ سخن" بھی کہا جاتا ہے۔ ہیئت و موضوع کے اعتبار سے خاص خاص اصنافِ سخن حسب ذیل ہیں۔

۱۔ غزل

غزل کی تعریف غزل کے لغوی معنی عورتوں سے بات چیت کرنے اور ان کے حسن و عشق کا ذکر کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں اشعار کے اس مجموعہ کو کہتے ہیں جس میں عاشقانہ مضامین کا بیان ہو لیکن حسن و عشق کے مضامین کے علاوہ فلسفہ، تصوف، اخلاقیات، معرفت الٰہی، پند و نصائح، رموز حیات و ممات وغیرہ بھی غزل کے دائرے میں داخل کر لئے گئے ہیں۔

غزل کی خصوصیات غزل کا پہلا شعر "مطلع" کہلاتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم ردیف اور ہم قافیہ ہوتے ہیں باقی اشعار

"فرد" کہلاتے ہیں جس کا مصرعہ ثانی مطلع سے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے۔ عموماً غزل میں ایک مطلع آتا ہے لیکن اس سے زائد بھی ہو سکتے ہیں۔ مطلع اوّل کے فوراً بعد جو مطلع کا شعر آتا ہے اس کو "حسنِ مطلع" یا "زیبِ مطلع" کہتے ہیں۔ بعد میں آنے والے مطلعے بالترتیب "مطلع ثانی" اور "مطلع ثالث" کہلاتے ہیں۔ غزل میں اشعار کی تعداد کم از کم تین یا پانچ سے لے کر زیادہ سے زیادہ پچیس تک ہوتی ہے۔ غزل کا ہر شعر مطلب کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے۔ غزل کے آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے اس شعر کو "مقطع" کہتے ہیں۔ تمام اصنافِ سخن میں صنفِ غزل کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ ہر دور اور ہر خاص و عام میں مقبول رہی دیگر اصناف کی طرح اس پر زوال نہیں آیا۔

اردو ادب میں غزل گوئی کے لئے ولی دکنی۔ میر۔ غالب۔ مومن۔ ذوق۔ داغ آتش۔ درد۔ فانی۔ حسرت اور جگر وغیرہ کے نام کافی مشہور ہیں۔

۲۔ قصیدہ

قصیدہ کی تعریف قصیدہ کے لغوی معنی "مغز" یا "گودے" کے ہیں۔ اصطلاح میں وہ اشعار جن میں کسی کی تعریف۔ ہجو یا شکایتِ زمانہ ہو "قصیدہ" کہلاتا ہے۔ قصیدے کے اشعار کا مضمون مسلسل ہوتا ہے یعنی ایک شعر کا مطلب دوسرے شعر سے مربوط ہوتا ہے۔

قصیدے کی خصوصیات قصیدے کے الفاظ شاندار اور بلند ہوتے ہیں۔ تشبیہات اور استعارات کے علاوہ مضمون کی بلندی اور زورِ بیان بھی قصیدے کے لئے لازم ہے۔ اشعار کی تعداد کم از کم پندرہ اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو تک ہوتی ہے۔ غزل کی طرح قصیدہ کا بھی پہلا شعر "مطلع" کہلاتا ہے اور باقی اشعار کے دوسرے مصرعے "مطلع" سے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اس میں بھی غزل کی طرح کئی مطلعے آتے ہیں۔

قصیدہ کسی عظیم الشان مقصد کے لئے لکھا جاتا ہے جو طویل اور مسلسل ہوتا ہے۔

جیساکہ پہلے لکھا جاچکا ہے قصیدے میں زبان ، مضمون کا انتخاب ، شاندار و پرشکوہ الفاظ، بلاغت اور جدّتِ بیان کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ قصیدے عام طور پر دو طرح کے ہوتے ہیں :۔ ۱۔ خطابیہ ۲۔ تمہیدیہ

خطابیہ قصائد میں شاعر ابتدا سے ہی بغیر کسی تمہید کے مقصد بیان کرنا شروع کر دیتا ہے اس کے برعکس تمہیدیہ قصائد میں تمہید جسے "تشبیب" کہتے ہیں بیان کرنے کے بعد شاعر اصل مقصد یعنی مدح سرائی پر آتا ہے۔ عموماً تمہیدیہ قصیدے لکھے گئے ہیں۔ جن کے اجزا حسب ذیل ہیں :۔

قصیدے کے اجزا :۔ (۱) مطلع (۱۱) تمہید یا تشبیب (۱۱۱) گریز (۱۷) مدح (۷) دعا۔

تمہید یا تشبیب میں مطلع کے فوراً بعد چند ایسے اشعار آتے ہیں جن میں شاعر اصل مقصد بیان کرنے سے پہلے تمہید کے طور پر موسمِ بہار، یا کسی ایسے موضوع کا ذکر کرتا ہے جس سے سننے والا دلچسپی کے ساتھ سننے کے لئے متوجہ ہو جائے۔

گریز قصیدہ کا وہ جزو ہے جو "تشبیب" اور "مدح" کے درمیان دو تین اشعار میں یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ شاعر اب اصل مقصد یعنی مدح سرائی کی طرف رجوع ہو رہا ہے۔ اسے ہم "رجوع" بھی کہتے ہیں۔

مدح یہ قصیدے کا سب سے اہم جزو ہوتا ہے جس میں شاعر اپنے ممدوح کی مدح سرائی کرتا ہے اور اس کی خوبیاں طرح طرح سے بیان کرتا ہے۔

دعا یہ قصیدے کا آخری جزو ہوتا ہے اس کو خاتمہ بھی کہتے ہیں اس میں شاعر ممدوح کے لئے دعا کرتا ہے اور اپنے لئے انعام واکرام کی اشارۃً خواہش کرتا ہے

اردو شاعری میں بہت سے شعرا نے قصیدے لکھے ہیں مگر محمد رفیع سودا اور ابراہیم ذوق کے قصائد بہت مشہور ہیں ۔ یہ دونوں شعراء قصیدے کے شہنشاہ کہلاتے ہیں۔

۳۔ مثنوی

مثنوی کی تعریف

مثنوی اصنافِ شاعری میں نظم کی وہ قسم ہے جس میں کوئی تاریخی واقعہ یا عشقیہ داستان بیان کی گئی ہو۔ مثنوی کا مضمون مسلسل ہوتا ہے۔ کچھ مثنویاں اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ مکمل کتاب بن جاتی ہیں۔ مثنوی کا ہر شعر الگ الگ قافیہ کا ہوتا ہے اس میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہے۔ مثنوی چونکہ طویل ہوتی ہے اس لئے اس میں قصّہ شروع کرنے سے پہلے حمد، نعت، مناجات اور بادشاہِ وقت کی تعریف ہوتی ہے اس کے بعد قصّہ شروع ہوتا ہے جس میں قصّہ کے دوران منظر نگاری، ملک کے رسم و رواج، لباس و زیور، اقسامِ خورد و نوش، مقامات، رزم و بزم کا ذکر، نشست و برخاست کے آداب اور خاص و عام کے جذبات بہت دلکش انداز میں نظم کئے جاتے ہیں۔

مثنوی کی خصوصیات

مثنوی میں روانی کے ساتھ ساتھ ایسی بہت سی خوبیاں ہوتی ہیں جو دوسری اصناف میں یک جا نہیں پائی جاتیں۔ جن کا ذکر ابھی اوپر کیا گیا ہے۔ مثنوی اصنافِ شاعری میں کسی مسلسل واقعہ یا قصّہ کو بیان کرنے کے لئے سب سے موزوں صنف ہے۔ کیونکہ اس میں غزل یا قصیدہ کی طرح اوّل سے آخر تک ایک ردیف اور قافیہ کی پابندی نہیں رہتی بلکہ ہر شعر کا جدا جدا قافیہ اور ردیف ہوتا ہے۔

اردو ادب میں میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم"۔ مرزا شوق کی مثنوی "زہرِ عشق" اور حفیظ جالندھری کی مثنوی "شاہنامہ اسلام" اپنی خصوصیات کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔

۴۔ مرثیہ

مرثیہ کی تعریف لفظ مرثیہ "رثاء" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں رونا، ماتم کرنا۔ اصطلاحِ شاعری میں "مرثیہ" اس نظم کو کہتے ہیں جس میں مُردے کے اوصاف کو اس طرح بیان کرنا کہ سننے والے کو رحم آئے۔ لفظ "مرثیہ" سے وہ نظم مراد ہوتی ہے جس میں کسی کی موت پر غم والم کا اظہار کیا جائے۔ لیکن اردو میں جب صرف "مرثیہ" کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے وہ نظم سمجھی جاتی ہے جس میں حضرت امام حسین رضؓ اور ان کے اعزاء و رفقاء کی شہادت کا بیان ہو۔ شہدائے کربلا کے علاوہ اگر کسی دوسرے شخص کا مرثیہ لکھنا ہوتا ہے تو شروع میں ہی بطورِ عنوان اس کی وضاحت کر دینا لازمی ہے مثلاً "مرثیہ داغ" "مرثیہ دہلی مرحوم" "مرثیہ غالب" وغیرہ۔

مرثیہ کی خصوصیات مرثیہ میں انسانی جذبات و احساسات کی بہترین ترجمانی ہوتی ہے۔ یوں تو پہلے تمام اقسامِ نظم میں مرثیے لکھے گئے مگر پھر ضمیر لکھنوی نے مرثیہ کے لئے "صنفِ مسدس" کو مخصوص کر دیا چنانچہ اس کے بعد سے مرثیے "مسدس" میں لکھے جانے لگے۔ انیس، اور دبیر صنفِ مرثیہ کے شہنشاہ ہیں۔ انھوں نے صنفِ مرثیہ کو معراجِ کمال پر پہنچایا۔ مرثیوں کے ذریعہ اردو زبان کی بہت خدمت ہوئی ہے۔ روزمرّہ۔ محاورے۔ صنائع و بدائع۔ جدّتِ بیان۔ قدرتی مناظر، حسنِ بیان۔ جذبات نگاری اور واقعہ نگاری وغیرہ کے بہترین نمونے انیس اور دبیر کے مراثی" مین ملتے ہیں۔ مرثیہ کے حسب ذیل اجزاء ہیں، مگر ضروری نہیں کہ ہر مرثیہ میں یہ تمام اجزاء پائے جائیں :۔

مرثیہ کے اجزاء :۔ (۱) چہرہ (۲) سراپا (۳) رخصت (۴) آمد (۵) رجز (۶) جنگ (۷) شہادت (۸) بین۔

۱۔ چہرہ :۔ اسے مرثیہ کی تمہید بھی کہتے ہیں ۔ تمہید کا موضوع مرثیہ کے اصل موضوع سے علیحدہ ہوتا ہے مثلاً صبح کا سماں ، گرمی کی شدت ، حمد ، نعت یا دعا وغیرہ ۔

۲۔ سراپا :۔ اس جزو میں مرثیے کے ہیرو کے خد و خال ، قد و قامت اور اس کی دوسری بہت سی خوبیوں کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

۳۔ رخصت :۔ مرثیہ کے اس حصے میں ہیرو کو اہلِ خانہ اور عزیزوں سے میدانِ جنگ میں جانے کے لئے رخصت چاہنے کا ذکر ہوتا ہے ۔

۴۔ آمد :۔ ہیرو کا میدانِ جنگ کی طرف شان و شوکت کے ساتھ بڑھنے کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

۵۔ رَجز :۔ ہیرو اس حصے میں اپنے بزرگوں کے کارناموں ، خاندانی تعلقات اور اپنی جنگی مہارت وغیرہ کو بیان کرتا ہے ۔

۶۔ جنگ :۔ مرثیہ کے اس حصہ میں میدانِ جنگ کے اندر لڑائی کا پورا سماں کھینچا جاتا ہے ۔ تلوار اور گھوڑے وغیرہ کی تعریف کے ساتھ ہیرو کی شجاعت کا مرثیہ نگار ذکر کرتا ہے ۔

۷۔ شہادت :۔ حضرت امام حسینؑ یا ان کے رفقا کی شہادت کا ذکر پُر اثر انداز میں کیا جاتا ہے ۔

۸۔ بین :۔ شہدائے کربلا کی شہادت پر گریہ وزاری کی منظر کشی کی جاتی ہے "ذکرِ شہادت" اور "بین" کی کامیابی پر ہی مرثیہ کی کامیابی کا انحصار ہے ۔ مرثیہ کے یہ دونوں اہم اجزاء ہیں جن کے بیان پر میر انیسؔ کو عبور حاصل تھا ۔

۵۔ رُباعی

"رباعی" چار مصرعوں والی نظم کو کہتے ہیں اس کو "دو بیتی" بھی کہا جاتا تھا کیونکہ اس میں دو شعر ہوتے ہیں ۔ رباعی کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے تیسرے

مصرعہ کا قافیہ ان سب سے جدا ہوتا ہے۔ رباعی کا چوتھا مصرعہ بہت بلند اور زور دار ہوتا ہے اتنا ہی نہیں بلکہ اس میں پوری رباعی کے مضمون کا خلاصہ اور نچوڑ ہوتا ہے۔

رباعی کا وزن " لاحول ولا قوۃ الا باللہ " مقرر ہے۔ رباعی میں اخلاقیات، وعظ و پند تصوف اور فلسفہ وغیرہ کے مضامین لکھے جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں انیس، اکبر الہ آبادی حالی، جوش، اور امجد وغیرہ کی رباعیات بہت مشہور ہیں۔

رباعیات :-

۱۔ خفگی بندے پہ بندہ پرور کیسی؟ بیکس پہ تیری طبع مکدر کیسی؟
اللہ عتاب بندۂ عاجز پر جب قدموں میں سر دیا تو ٹھوکر کیسی؟

۲۔ ہم صحبت بے خرد پریشان رہا۔ نا فہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی۔ نادان کو الٹا بھی تو نادان رہا

(امجد)

مثال کے طور پر دو رباعیاں لکھی گئی ہیں ہر ایک رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہے جب کہ اس کا تیسرا مصرعہ بقیہ تینوں مصرعوں سے الگ قافیہ رکھتا ہے۔ رباعی کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

نوٹ :- مندرجہ بالا رباعیات میں سے پہلی رباعی کے متعلق لکھا ہوا ہے کہ یہ ایک بہت بڑے بزرگ کی ہے۔ بوقت پریشانی اس رباعی کو اگر بار بار رقت کے ساتھ پڑھ کر دعا مانگی جائے تو انشاء اللہ پریشانی ٹل جائے گی (واللہ اعلم بالصواب)

۶۔ قطعہ

"قطعہ کے لغوی معنی "ٹکڑے" کے ہیں۔ اصطلاحِ شاعری میں اس نظمِ مسلسل کو کہتے

ہیں جو دو اشعار سے کم کی نہ ہو۔ ہاں اس سے زیادہ اشعار ہو سکتے ہیں مگر اس نظم میں "مطلع" نہ ہو۔ یعنی بغیر مطلع کی مسلسل نظم کو قطعہ کہتے ہیں اس کے ہر شعر کا دوسرا مصرعہ اوپر کے شعر کا ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے۔ قطعہ کے اشعار مربوط ہوتے ہیں۔

موجودہ دور میں اس صنفِ شاعری کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ حالی، جوش، اقبال، فراق، اکبر الٰہ آبادی، اور اختر انصاری مشہور اور کامیاب قطعہ گو ہیں۔

قطعات :-

۱۔ بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں | اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا | کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

(اکبر الٰہ آبادی)

۲۔ کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو اِک شہر تھا عالم میں انتخاب
بستے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے

(میر تقی میرؔ)

قطعہ اور غزل میں فرق :- قطعہ اور غزل میں دو نمایاں فرق ہیں :-

۱۔ قطعہ میں غزل اور قصیدہ کی طرح مطلع کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

۲۔ قطعہ کے سب ہی اشعار کو ملا کر مضمون پورا ہوتا ہے یعنی اس کا ہر شعر ایک دوسرے سے مربوط ہوتا ہے جب کہ غزل کا ہر شعر جدا جدا مطلب رکھتا ہے۔

۷۔ ترجیع بند

غزل یا قصیدہ کے طور پر کہی ہوئی نظم کو ترجیع بند کہتے ہیں جس میں کم از کم پانچ اور زیادہ

سے زیادہ گیارہ اشعار ہوتے ہیں۔ غزل اور قصیدے کی طرح اس میں بھی پہلا شعر مطلع کا ہوتا ہے اور اس بند کا مصرعہ ثانی مطلع سے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے ہر بند کے آخیر میں ایک شعر آتا ہے جو وزن میں پہلے آئے ہوئے اشعار کے برابر ہوتا ہے لیکن قافیہ و ردیف کے اعتبار سے ان سے مختلف ہوتا ہے اس شعر کے آنے کے بعد ایک بند مکمل ہو جاتا ہے۔ جب دوسرے بند کے اشعار شروع کرنے ہوتے ہیں تو پھر اس کا پہلا شعر نئے مطلع سے شروع ہوتا ہے جو پہلے بند کے مطلع سے مختلف ہوتا ہے اور اس کے مصرعہ ثانی پہلے بند کی طرح اس بند کے مطلع سے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔ اس طرح اس نظم کے کئی بند ہو سکتے ہیں اور پہلے بند کے آخیر میں آنے والا شعر بار بار ہر بند کے آخیر میں آتا ہے یعنی ترجیع بند میں آخیر میں آنے والا شعر جو "ٹیپ" کہلاتا ہے، بدلتا نہیں۔ بعینہٖ وہی ہوتا ہے جو پہلے بند کو دوسرے بند سے اور دوسرے بند کو تیسرے بند سے الگ کرتا ہے۔ ہر بند کے اشعار کی تعداد کا برابر ہونا ضروری نہیں ہے۔

ترجیع بند کی مثال :۔

جو موقع پاکر کھوئے گا — وہ اشکوں سے منہ دھوئے گا
جو سوئے گا، وہ روئے گا — اور کاٹے گا جو بوئے گا
تو غافل کب تک سوئے گا — جو ہونا ہو گا، ہوئے گا

اٹھ باندھ کمر، کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ، خدا کیا کرتا ہے

یہ دنیا آخر فانی ہے — اور جان بھی اک دن جانی ہے
پھر تجھ کو کیوں حیرانی ہے — کر ڈال جو دل میں ٹھانی ہے
جب ہمت کی جولانی ہے — تو پتھر بھی پھر پانی ہے

اٹھ باندھ کمر، کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ، خدا کیا کرتا ہے

۸۔ ترکیب بند

ترکیب بند کی بالکل وہی تعریف اور خصوصیت ہے جو ترجیع بند کی۔ بناوٹ یا ہیئت کے اعتبار سے بھی ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ ترکیب بند میں ہر بند کے بعد "ٹیپ" کا شعر یا مصرعہ بدلتا رہتا ہے جب کہ ترجیع بند میں نہیں بدلتا۔ جیسا کہ مثالوں سے واضح ہے :۔

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں — روپے کے ان کے پاؤں ہیں سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تا بہ شرق ہیں — کمخواب، تاش، شال، دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر — ہیں آدمی ہی صاحبِ عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں اور آدمی ہی پیر — اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیرؔ
اور سب میں جو برا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

("آدمی نامہ" — نظیر اکبر آبادی)

۹۔ مسمّط (وہ نظم جو بندوں پر مشتمل ہو)

اس کے لغوی معنی ہیں "موتیوں کی لڑی" لیکن اصطلاحِ شاعری میں اس نظم کو کہتے ہیں جس کے چند مصرعے ایک وزن ایک قافیہ میں کہے جائیں، پھر اسی وزن کے کئی بند کہہ کر ہر ایک بند کے قافیہ کو دوسرے بند کے قافیہ سے مختلف رکھا جائے۔ ہر بند کے آخر میں ایک مصرعہ یا شعر تکرار کے ساتھ آتا ہے یا بدلتا رہتا ہے مگر اس آخری شعر کا قافیہ عموماً وہی ہوتا ہے جو مطلع کا، مگر یہ ضروری بھی نہیں ہے کیونکہ مسمط کی مختلف قسموں میں آخری شعر کا قافیہ بدلتا بھی رہتا ہے۔

یوں تو ہیئت کے اعتبار سے مسمط کی بہت سی قسمیں ہیں مگر یہاں پر صرف انہیں کا ذکر کیا گیا ہے جو عام طور پر مستعمل ہیں :-

۱۔ مثلث :- وہ نظم جس کے ہر بند میں تین مصرعے ہوتے ہیں ۔ ان میں شروع کے دو مصرعے ہم قافیہ اور تیسرا خلاف قافیہ ہوتا ہے ۔

۲۔ مربع :- وہ مسمط جس کے ہر بند میں چار مصرعے ہوں ۔ تین مصرعے ہم قافیہ اور چوتھا ان سے مختلف قافیہ کا ہوتا ہے ۔

۳۔ مخمس :- مخمس کے معنی ہیں " پانچ کونوں والا " اسی مطابقت سے پانچ مصرعوں والی نظم کو " مخمس " کہتے ہیں ۔

۴۔ مسدس :- مسمط کی قسموں میں یہ سب سے زیادہ مشہور اور مستعمل صنفِ شاعری ہے ۔ وہ نظم جس کے ہر بند چھے مصرعوں پر مشتمل ہوں " مسدس " کہلاتی ہے ۔ ہر بند کے پہلے چار مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اس کے بعد کے دو مصرعے مختلف قافیہ میں ہوتے ہیں جسے " ٹیپ " کہتے ہیں ۔ مولانا الطاف حسین حالی کی مشہور نظم " مد و جزر اسلام " شروع سے آخر تک نظم مسدس ہے اس لئے یہ نظم اصلی نام کے بجائے " مسدس حالی " کے نام سے مشہور ہے ۔ انیس و دبیر کے بیشتر مرثیے " مسدس " کی شکل میں ہیں ۔ چکبست اور حالی نے بھی طویل نظمیں اسی صنف میں لکھی ہیں ۔ مثال :-

یہی نوجواں پھرتے آزاد جو ہیں — کمینوں کی صحبت میں برباد جو ہیں
شریفوں کی کہلاتے اولاد جو ہیں — مگر ننگِ آبا و اجداد جو ہیں

اگر نقدِ فرصت نہ یوں مفت کھوتے
یہی فخرِ آبا و اجداد ہوتے (مسدس حالی)

۱۰۔ مستزاد

مستزاد کے لغوی معنی ہیں " زیادہ کیا گیا " لیکن شعری اصطلاح میں اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر مصرعہ کے آخر میں ایک موزوں فقرہ جو مصرعہ کے اصل وزن

سے زائد ہوتا ہے بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ زائد فقرے غزل، رباعی یا کسی بھی نظم کے مصرعوں کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔ ان زائد فقروں کو الگ کر دینے سے اشعار کے مطلب یا اس کے وزن میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کچھ شعراء ہر مصرعہ کے ساتھ زائد فقرہ نہ لگا کر صرف دوسرے مصرعہ میں "فقرۂ مستزاد" لاتے ہیں۔ کچھ قدیم شعراء کے یہاں اس صنفِ شاعری کا استعمال زیادہ ہوا ہے۔ مستزاد :۔

تا چند غمِ دل سے شکایت کریئے — ہو ہو کر تنگ
کس کس سے شب و روز شکایت کریئے — آتا ہے ننگ
سختی کوئی اے صنم کہاں تک کھینچیے — ہے جی میں کہ اب
ہو نالہ ترے دل میں سرایت کریئے — پر تو تو ہے سنگ

(میر تقی میر)

۱۱۔ تضمین

وہ نظم یا شعر جس میں کسی شاعر کے مشہور شعر یا مصرعہ کے ساتھ شاعر اپنا مصرعہ جوڑ دیتا ہے "تضمین" کہلاتا ہے مثلاً :۔

۱؎ یہ رنگ برنگی تقریریں، یہ آڑی ترچھی تحریریں
"سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ" ← (نظیر اکبر آبادی)

۲؎ وہی وعدہ اردو زباں کا وہی روزی روٹی کا سلسلہ
"مجھے یاد ہے وہ ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" ← (مومن)

مذکورہ بالا شعری اصناف کے علاوہ موضوع کے اعتبار سے حسب ذیل قسمیں بھی نظم میں شمار ہوتی ہیں :۔

۱۔ حمد :۔ وہ نظم جس میں خدا کی تعریف اور اس کی بڑائی کا ذکر کیا گیا ہو۔

۲۔ نعت :۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی صفات اور سیرت پاک کے سلسلہ میں لکھی جانے والی نظم کو "نعت" کہتے ہیں خواہ وہ غزل، مثنوی یا قصیدہ میں ایک جزو کی حیثیت

سے ہو یا الگ سے کسی نظم کی شکل میں ۔

۳۔ **مَنقبت** :۔ اہلِ بیت ، خلفائے راشدین ، بزرگانِ دین اور خصوصاً حضرت علیؓ کی مدح و شان میں کہی جانے والی نظم کو "مَنقبت" کہتے ہیں ۔

۴۔ **مُناجات** :۔ وہ نظم جس میں خداوند تعالیٰ سے دعا مانگی جائے "مناجات" کہلاتی ہے ۔

۵۔ **شہر آشوب** :۔ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں ملک کی تباہی و پریشان حالی ، اخلاقی گراوٹ ، بدنظمی اور عوام کی مصیبتوں کا ذکر کیا گیا ہو سودا اور میر نے کامیاب "شہر آشوب" لکھے ہیں ۔

۶۔ **ریختی** :۔ ایسے اشعار جن میں عورتوں کی زبان میں شاعری کی گئی ہو "ریختی" کہلاتے ہیں ۔ صنفِ شاعری کی یہ نئی قسم دبستانِ لکھنؤ کے شعراء کی دین ہے خاص طور سے رنگین ، جرأت ، انشاء اور جان اس کے ماہر تھے جیسے :۔

ؔ میں ترے صدقے ، نہ رکھ پیاری روزہ

بندی رکھنے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

اقسامِ نثر

نثر کے معنی ہیں" پراگندہ کرنا یا بکھیرنا" اس کلام کو بھی نثر کہتے ہیں جو برخلاف نظم کے ہو۔ الفاظ کے اعتبار سے نثر کی مندرجہ ذیل تین قسمیں ہیں:۔

۱۔ نثرِ مقفیٰ و مسجع ۲۔ نثرِ مرجز ۳۔ نثرِ عاری

۱۔ **نثرِ مقفیٰ و مسجع:۔** وہ نثر جس کے ہر فقرے کے آخری کلمات قافیہ پر ختم ہوتے ہوں "نثرِ مقفیٰ" کہلاتی ہے اور جس نثر کے دونوں فقروں کے الفاظ عبارت کو سجانے کے خیال سے مساوی رکھے گئے ہوں "نثرِ مسجع" کہلاتی ہے۔ چونکہ قدیم نثر میں عموماً یہ دونوں خوبیاں ساتھ ساتھ پائی جاتی تھیں اس لئے دونوں کو ایک ساتھ ملاکر "نثرِ مقفیٰ و مسجع" کہا جانے لگا۔

۱۸۵۷ء سے پہلے اردو کے قدیم نثار اسی طرح کی نثر لکھتے تھے۔ رجب علی بیگ سرور کی مشہور کتاب "فسانۂ عجائب" اور رتن ناتھ سرشار کی شہرۂ آفاق تصنیف "فسانۂ آزاد" مقفیٰ و مسجع عبارت سے بھرپور عظیم شاہکار ہیں۔ ان کتابوں کی طویل عبارت تو ہم بطور مثال یہاں نہیں لکھ رہے ہیں۔ صرف چند جملے تحریر ہیں جن سے نثرِ مقفیٰ و مسجع کا اندازہ ہو جائے گا۔

مثال:۔ ۱۔ "دیو ڈھونڈتا ہوا بنگلے میں آیا۔ دیکھا مہر و ماہ گردشِ سپہر سے مہرے برج زمردیں میں بے ہوش ہیں۔ چہرے کے رنگ اڑے ہوئے۔ سکتے کی حالت میں ہم آغوش ہیں۔ روئے یار آئینہ دار درمیان ہے۔ فلک برسرِ امتحان ہے۔" (فسانۂ عجائب)

۲۔ "جو کوئی حاتم کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر پکڑ لاوے پانچ سو اشرفیاں بادشاہ کی سرکار سے انعام پاوے۔" (باغ و بہار)

دبستانِ لکھنو کے اہلِ قلم صرف اپنی تصانیف میں ہی نہیں مقفیٰ و مسجع عبارت کے جوہر

دکھاتے تھے بلکہ اخبارات میں بھی اسی طرزِ تحریر کو اپنانا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ انگریز سرکار کے خلاف ایک اخبار لکھتا ہے :۔

۳۔ "عہد و پیمان کے خلاف اگر سرکار کو ریاست چھین لینے پر اصرار ہے۔ تو یہاں بھی ہر ایک مردِ میداں جان دینے کو تیار ہے۔ جس دم معرکۂ کارزار کی گرم بازاری ہوگی۔ دیکھ لینا کیسی ذلت و خواری ہوگی۔" (اخبار طلسم جنوری ۱۸۵۶ء)

۲۔ نثرِ مرجز :۔ اقسامِ نثر کی یہ دوسری قسم ہے اس نثر میں دو فقروں کے کلمات آپس میں ہم وزن تو ہوتے ہیں مگر ان میں قافیہ نہیں ہوتا جیسا کہ نثرِ مقفیٰ میں ہوتا ہے جیسے :۔

مثال (۱) ۔ "قامتِ موزوں کے روبرو سرو رواں ناچیز ہے اور کاکلِ پیچاں کے سامنے مُشکِ ختن بے قدر ہے۔"

۲۔ "ایک شاخ سے دو پھول نکالتا ہے۔ ایک کو حسینوں کے گلے کا ہار بناتا ہے دوسرا قبر پر چڑھایا جاتا ہے۔ آسمان کی وہی بارش جو انگور پیدا کرتی ہے، اسی سے اونٹ کٹارے پیدا ہوتے ہیں۔ چرخ کی ایک گردشِ دولابی نے حضرت یوسفؑ کو عزیزِ مصر کر دکھایا، اسی آسمان کی ایک کروٹ میں نادر، تیمور، چنگیز خاں و ہلاکو سی بے گنتی کٹھ پتلیاں نکل پڑیں۔"

۳۔ نثرِ عاری :۔ نثر کی یہ وہ قسم ہے جو نہ تو مقفیٰ و مسجع ہوتی ہے اور نہ مرجز یعنی اس نثر میں وہ خواص نہیں پائے جاتے جو مذکورہ بالا دونوں قسموں کی نثر میں ہوتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر جو نثر سلاست، فصاحت، متانت اور بلاغت کے اعتبار سے بہترین کہی جا سکے وہ نثرِ عاری کے زمرے میں آتی ہے۔

عبدالحلیم شررؔ۔ محمد حسین آزادؔ۔ شبلی نعمانیؔ اور حسن نظامیؔ وغیرہ کے مضامین نثرِ عاری کے بہترین نمونے ہیں۔

موجودہ دور میں جو نثر لکھی جا رہی ہے وہ نثرِ عاری کی بہت سلیس اور سادی شکل ہے اس میں فصاحت اور بلاغت پر زیادہ زور نہ دیکر سلاست، سادگی، عام فہم الفاظ اور روزمرہ پر زیادہ دھیان دیا جاتا ہے جن کا نمونہ ہمیں سر سید احمد خاں، رشید احمد صدیقی، منشی پریم چند اور آج کے بہت سے دوسرے لکھنے والوں کی تحریریں ملتا ہے۔

مثال نثرِ عاری : ۔ " دربار میں یہ شانِ پروردگار آشکار تھی کہ دفعتاً بادشاہ آبدیدہ ہوئے اور دونوں ہاتھ فاتحہ کو اٹھائے مگر پاسِ ادب سے کوئی شخص جرأت سوال نہ کر سکا۔ بعد فاتحہ کے خود بادشاہ نے کہا اے بندگانِ با اخلاص! جو خیال اس وقت میرے دل میں گزرا وہ یہ ہے کہ فرعون نے ایک آبنوس اور ہاتھی دانت کے تخت پر بیٹھ کر دعویٰ خدائی کا کیا، گواہ اور آگاہ ہو کہ جس نخوت و تکبر سے اس نے وہ دعویٰ کیا تھا میں اس سے لاکھ مرتبہ عجز و نیاز کے ساتھ عبودیت الٰہی کا اقرار کرتا ہوں۔"

(محمد حسین آزاد)

"اُردو ادب کا لہلہاتا ہوا باغ تنہا ایک باغباں کی محنت کا ثمرہ نہیں۔ اس کی آبیاری، مختلف جماعتوں، مذاہب اور ممالک نے مل کر کی ہے۔ اس کی تعمیر میں بہتوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ فقیروں اور درویشوں نے اس پر برکت کا ہاتھ رکھا ہے، بادشاہوں نے اسے منھ لگایا ہے، سپاہیوں نے زبانِ تیغ اور تیغِ زبان دونوں کے جوہر دکھائے ہیں۔ پھر بھی یہ جمہور کی زبان اور جمہور کا ادب ہے"

(آل احمد سرور)

موضوع کے اعتبار سے نثر کی قسمیں

نظم کی طرح نثر کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ یہ اپنے اندازِ تحریر اور موضوع کے اعتبار سے اردو ادب میں مختلف ناموں سے پہچانی جاتی ہیں۔ ہم یہاں پر ہر ایک کی مختصر تعریف اور اس صنف کے مشہور نثار کا نام لکھ رہے ہیں تاکہ آپ کو اقسامِ نثر اور اس کے مشہور مصنفین کے متعلق علم ہو سکے۔

۱۔ داستان

داستانیں اردو ادب میں قدیم طرزِ تحریر کے نمونے ہیں اور یہ اس دور کی یاد دلاتی ہیں جب سیاسی اور تہذیبی حالات رو بہ زوال تھے۔ لوگ مستقل ناکامیوں، نامرادیوں اور عظیم جدوجہد سے تنگ آکر ایک ذہنی سکون اور گوشۂ عافیت کے خواہاں تھے۔ داستانوں نے انھیں وقت گذاری اور دل بستگی کا سامان فراہم کیا۔ داستانیں زندگی کے حقائق سے دور مافوق الفطرت قصّوں پر مبنی ہوتی تھیں۔

داستانوں کی عبارت اس دور کے اندازِ تحریر کے مطابق مشکل الفاظ، مقفیٰ و مسجع عبارت اور تصنع آرائی سے پُر ہوتی تھی۔ اردو میں داستانوں کا آغاز پہلے منظوم قصّوں سے ہوا مثلاً مثنوی شعلۂ عشق، "خواب و خیال" "مثنوی سحر البیان" اور "گلزارِ نسیم" وغیرہ۔ داستانوں کے فروغ میں فورٹ ولیم کالج کا بہت بڑا ہاتھ ہے اس میں شک نہیں کہ ان داستانوں سے اردو زبان کے ذخیرے میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ داستان نگاروں میں میر امّن دہلوی، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، محمد حسین جاہ، رجب علی بیگ سرور وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اردو میں داستانوں کے لکھنے کا سلسلہ بہت عرصہ تک جاری رہا اور بہت سی داستانیں اس زبان میں لکھی گئیں لیکن جب ڈپٹی نذیر احمد نے ناول نگاری

کا آغاز کیا تو اس کی مقبولیت کی وجہ سے رفتہ رفتہ داستانوں کی اہمیت ختم ہو گئی ۔ چونکہ اردو زبان کی نشو نما اور فروغ میں ان داستانوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے اس لئے آج بھی ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

اردو ادب میں حسب ذیل داستانیں کافی مقبول ہیں :۔ باغ و بہار، طوطا کہانی ۔ الف لیلیٰ ۔ سنگاسن بتیسی ۔ بیتال پچیسی ۔ گل بکاولی ۔ طلسم ہوشربا ۔ آرائشِ محفل ۔ حاتم طائی اور فسانۂ عجائب وغیرہ ۔

۲۔ ناول

"ناول" انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "عجیب و غریب چیز" اصطلاحِ ادب میں ناول افسانوں کی ایک خاص صنف کو کہا جاتا ہے ۔ یہ صنف انگریزی ادب کے اثر سے اردو میں آئی ۔ ناول کی تعریف میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ نثری قصہ ہے جس میں صنعتی عہد کے پس منظر میں فرد اور سماج کی کشمکش کو دکھایا گیا ہو ۔

حقیقت ہے کہ ناول نگاری کا فن ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت زندگی کے حقائق کی تصویر کشی کرتا ہے ۔ انگریز مصنف پرسٹلے کا کہنا ہے کہ "ناول زندگی کا آئینہ دار ہے" ناول کا موضوع فرد ہے اور اوّل تا آخیر ناول کا پورا پلاٹ اس فرد یا معاشرہ کے گرد گھومتا ہے ۔ جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنے سماجی پس منظر کے ساتھ قارئین کے سامنے آتا ہے ۔

ناول کے اجزائے ترکیبی :۔ (۱) پلاٹ (۲) کردار (۳) مکالمہ (۴) منظر نگاری (۵) نظریۂ حیات ۔

اردو ادب میں ناول نگاری کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد سے ہوتا ہے ، اسی لئے ان کو ناول کا موجد کہا جاتا ہے ۔ ان کا ہی نہیں بلکہ اردو زبان کا بھی سب سے پہلا ناول "مراۃ العروس" ہے جو ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا ۔ نذیر احمد سے پہلے کوئی ایسی تصنیف نہیں ملتی جسے "ناول" کہا جا سکے ۔ ان سے پہلے کی بیشتر نثری تصانیف داستانوں میں شمار

کی جاتی ہیں جن کی حیثیت حسین خوابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ناول اور زندگی کا ساتھ چولی دامن جیسا ہے۔ ناول کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس سے اصلاح اور تبلیغ کا کام لیا جاسکتا ہے۔ نذیر احمد کے بعد رتن ناتھ سرشار کا نام آتا ہے ان کی مشہور تصنیف "فسانۂ آزاد" میں کسی حد تک ناول کی جھلک ملتی ہے۔ ان کے علاوہ اردو ادب میں ناول نگاری کے لئے حسب ذیل نام قابلِ ذکر ہیں:۔

عبدالحلیم شرر۔ مرزا ہادی رسوا۔ راشد الخیری۔ پریم چند۔ سجاد ظہیر۔ عادل رشید۔ گلشن نندہ۔ کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر وغیرہ۔

۳۔ مختصر افسانے

افسانہ اردو ادب کی سب سے مقبول صنف ہے۔ اس کا ارتقاء تو کسی حد تک ناول کے ساتھ ہی ساتھ شروع ہوگیا تھا مگر ۱۸۵۷ء کے بعد مغربی ادب کے اثر سے یہ صنف نمایاں طور پر ظہور میں آئی اور بیسویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے اس صنف نے اپنی مقبولیت کا لوہا منوالیا۔ افسانے کی تعریف مختلف لوگوں نے مختلف لفظوں میں کی ہے۔ مثلاً "یہ ایک ایسی نثری داستان ہے جس کے پڑھنے میں ہمیں آدھے گھنٹہ سے دو گھنٹے تک کا وقت لگتا ہے (ایڈگر ایلن)۔

ایک ناقد نے افسانہ کی تعریف اس طرح کی ہے:۔

"مختصر افسانہ کسی ایک واقعہ کا بیان ہے جس میں ابتدا ہو، درمیان ہو، عروج ہو، خاتمہ ہو"

ناول کی طرح مختصر افسانہ بھی زندگی کے حقائق اور اس کے تقاضے کو اجاگر کرتا ہے اس میں بھی ہمارے گرد و نواح کے واقعات اور زندگی کے مسائل کا ذکر ہوتا ہے۔ ناول اور افسانہ میں جہاں مذکورہ بالا یکسانیت پائی جاتی ہے وہاں ان دونوں کے درمیان کچھ نمایاں فرق بھی ہے۔

ناول اور مختصر افسانے کا فرق:۔ (۱) ناول زندگی کی وسعت اور اس کے گوناگوں

واقعات کی عکاسی کرتا ہے جب کہ مختصر افسانہ وسیع زندگی کے صرف کسی ایک گوشہ، کسی ایک واقعہ یا کسی ایک نفسیاتی حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے۔ (۲) ناول میں تفصیلات کی گنجائش ہوتی ہے جب کہ افسانہ اختصار چاہتا ہے۔ (۳) ناول میں کرداروں کی تعداد پر کوئی بندش نہیں ہے مگر یہاں مختصر افسانوں میں کرداروں کی تعداد کم سے کم ہوتی ہے۔

(۴) ناول میں قارئین کی توجہ اس کے واقعات کے ساتھ ساتھ گھٹتی یا بڑھتی رہتی ہے مگر مختصر افسانہ میں قاری کی توجہ کسی ایک واقعہ کی طرف ہی مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے۔

افسانے میں تاثر جب ہی پیدا ہوتا ہے جب وہ حقیقت سے قریب ہو ایک اچھے افسانہ کی یہ خوبی ہے کہ اس کے کردار وہی زبان بولتے ہوں جس طبقہ اور ماحول سے وہ تعلق رکھتے ہیں۔ افسانے کے کردار زندہ ہوں اور کہانی آس پاس کے ماحول اور زمانے کے مطابق ہو۔ اس میں اچھے پلاٹ، کردار اور تکنیک کے ساتھ ساتھ کوئی اخلاقی یا معاشرتی اصلاح کا پہلو بھی ہو۔

مختصر افسانے کے اجزائے ترکیبی :- (۱) پلاٹ (۲) کردار نگاری (۳) تکنیک یا فن

مختصر افسانے کا آغاز پریم چند سے ہوتا ہے۔ انھیں افسانوں کا شہنشاہ کہا جاتا ہے۔ اردو افسانے کی ابتدائی دور کے مشہور افسانہ نگاروں میں پریم چند، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور علی عباس حسینی کے نام سرِفہرست ہیں۔ پریم چند اور ان کے ہم عصروں کے بعد ایک نئی تحریک جو "ترقی پسند تحریک" کہی جاتی ہے ۱۹۲۹ء میں شروع ہوئی۔ اس تحریک کے روحِ رواں علی سردار جعفری، عصمت چغتائی، سجاد ظہیر اور منٹو تھے۔ ان کے علاوہ اردو کے مشہور افسانہ نگاروں میں راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، کرشن چندر، نیاز فتح پوری اور قرۃ العین حیدر وغیرہ کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۴۔ ڈرامہ

ڈرامہ ادب کی سب سے قدیم صنف ہے۔ یہ یونانی زبان کے لفظ "ڈراماٹے" سے نکلا ہے اس کے معنی ہیں "کرنا" یا "کر کے دکھانا"۔ اس کو "ناٹک" بھی کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے ڈرامہ کی تعریف اس طرح کی ہے: "یہ ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس میں زندگی

کے حقائق و مظاہر کو اشخاص اور مکالموں کے وسیلے سے عملاً پیش کیا جائے"۔ ڈرامہ کا موضوع وہی ہے جو ناول کا۔ یہ دونوں زندگی کے واقعات اور مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ دونوں کی کہانی کردار کے ذریعہ مکمل ہوتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ ڈرامہ کے کردار بولتے چالتے اور کام کرتے نظر آتے ہیں جب کہ ناول کے کردار خاموش اور غیر متحرک ہوتے ہیں۔ ڈرامے دو طرح کے ہوتے ہیں (۱) المیہ (۲) طربیہ۔

ڈرامہ کے اجزائے ترکیبی:۔ ڈرامے کے اجزائے ترکیبی تقریباً وہی ہیں جو ناول کے۔ (۱) قصّہ یا پلاٹ (۲) کردار (۳) مکالمہ (۴) مرکزی خیال۔

ڈرامہ کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا۔ واجد علی شاہ کے ڈرامہ" رادھا کنھیا" سے اردو ڈرامہ کی ابتداء ہوئی اُسے اسٹیج پر پیش بھی کیا گیا۔ اس کے بعد اردو کے مشہور ڈرامہ " اندر سبھا" کو جسے ۱۸۵۲ء میں امانت نے لکھا کافی مقبولیت حاصل ہوئی قدیم ڈرامہ نویسوں میں آغا حشر کاشمیری اور امتیاز علی تاج کے نام بہت مشہور ہیں۔ اردو کا مشہور ڈرامہ" انارکلی" سید امتیاز علی تاج کا لکھا ہوا ہے ان کے علاوہ اردو ڈرامہ نگاروں میں اپندر ناتھ اشک، شوق قدوائی، عبدالماجد دریاآبادی، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر محمد حسین سید عابد حسین، حبیب تنویر اور اشتیاق حسین وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ موجودہ دور میں اسٹیج ڈرامے تقریباً ختم ہو چکے ہیں ان کی جگہیں سینما اور ٹی۔ وی نے لے لیں ہیں ہلانثری ڈرامے اب بھی ریڈیو سے پیش کئے جاتے ہیں۔

۵۔ انشائیہ

اردو کی دیگر نثری اصناف کی طرح " انشائیہ" بھی ایک خاص صنف ہے۔ انشائیہ کے تقریباً وہی مفہوم و معنی سمجھے جاتے ہیں جو انگریزی کے لفظ" ESSAY " سے مراد ہے اس کو" مضمون" بھی کہا جاسکتا ہے۔ ناول اور افسانہ کی طرح" انشائیہ" بھی مغربی ادب کے اثر سے وجود میں آیا۔" انشائیہ" کی بندھی ٹکی کوئی ایک مخصوص تعریف نہیں ہے انشاپرداز کی اپنی ذہنی اُپج خیالات کی بلندی اور ذاتی تاثرات کو فنی انداز میں پیش کرنے کا نام انشائیہ ہے۔ انشائیہ کا لکھنے والا اس کا خیال رکھتا ہے کہ اس میں علمیت یا افکار و مسائل کا بیان

نہ صرف تخلیقی طور پر ہو بلکہ اس کی عبارت ادبی چاشنی، شگفتگی، تاثر اور مزاح سے بھرپور ہو۔ قاری اس کو پڑھ کر ذہنی آسودگی کے ساتھ ساتھ قلبی مسرت بھی محسوس کرے۔

انشاء پرداز کا کمال یہ ہے کہ وہ آزاد خیالی کے ساتھ بات میں بات پیدا کرتا ہوا اپنے مضمون کو نئے نقطۂ نظر اور نئی روشنی کے ساتھ دلچسپ انداز میں پیش کرے۔ اردو ادب میں "انشائیہ" کا آغاز سر سید کے ان مضامین سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں لکھے۔ انشائیہ میں مذہبی، سماجی، اخلاقی، علمی اور سیاسی غرض سب ہی طرح کے مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ انشاء نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ زبان و بیان پر پوری قدرت رکھتا ہو ورنہ انشائیہ جس خوبصورت عبارت کا نام ہے اس کا حق وہ ادا نہ کر سکے گا۔ اردو انشائیہ کا مستقبل روشن ہے۔ انشاء پردازوں میں محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد مہدی افادی، فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، حسن نظامی، نیاز فتح پوری، رشید احمد صدیقی اور کنہیا لال کپور کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

تنقید، سوانح، خاکہ اور مزاح نگاری

جن نثری اصناف کا ذکر کیا جا چکا ہے ان کے علاوہ اردو ادب میں تنقید نگاری، سوانح نگاری، خاکہ نگاری اور مزاح نگاری بھی ہیں۔ ذیل میں ان کے مختصر تعارف کے بعد بالترتیب مشہور نقادوں، سوانح نگاروں، خاکہ نگاروں اور مزاح نگاروں کے نام بھی تحریر کئے گئے ہیں۔

۶۔ تنقید

تنقید کرنے والے کو ناقد یا نقاد کہتے ہیں۔ اردو میں ادبی تنقید کا آغاز محمد حسین آزاد کی مشہور کتاب "آب حیات" سے ہوتا ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے میر تقی میر نے "نکات الشعراء" لکھا تھا جو تنقیدی کتاب نہیں کہی جا سکتی بلکہ "تذکرہ" ہے۔ اردو میں حالی کی "مقدمہ شعر و شاعری" سب سے مستند اور پہلی تنقیدی کتاب ہے جو فن تنقید کی راہ دکھاتی ہے۔ اردو ادب میں نقاد کی حیثیت سے محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، عبدالحق، آل احمد سرور،

احتشام حسین، سید مسعود حسن رضوی اور ڈاکٹر قمر رئیس کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

۷۔ سوانح نگاری

انیسوی صدی کے آخر میں مولانا حالی اور شبلی نعمانی نے سوانح نگاری کا آغاز کیا۔ سوانح میں عام طور پر زندگی کے کسی خاص شعبہ سے تعلق رکھنے والی کسی مشہور اور ممتاز ہستی کے حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں کا ذکر ہوتا ہے۔ سوانح نگار کی حیثیت سے ذیل کے مصنفین اور ان کی تصانیف کا اردو ادب میں بڑا مقام ہے۔

حالی کی "یادگارِ غالب" "حیات جاوید" "حیات سعدی"۔ شبلی کی "الفاروق" عبدالغفار کی "آثارِ ابوالکلام آزاد"۔ غلام رسول مہر کی "غالب" وغیرہ اردو میں سوانح نگاری کے بہترین نمونے ہیں۔

۸۔ خاکہ نگاری

اس میں بھی سوانح کی طرح کسی کی شخصیت یا سیرت کی قلمی تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خاکہ میں اختصار اور قدرے مزاح یا تاثر سے کام لیا جاتا ہے۔

خاکہ نگاری میں اشاروں سے موصوف کی سیرت کے کچھ ایسے نقوش ابھارے جاتے ہیں جو اس کے کردار کا ایک زندہ اور حقیقی تصور پیش کر سکیں۔ اردو ادب میں عبدالحق، فرحت اللہ بیگ، حسن نظامی اور رشید احمد صدیقی کے نام خاکہ نگاری کے لئے بہت مشہور ہیں۔

۹۔ مزاح نگاری

انشائیہ کی یہ وہ قسم ہے جس میں بامحاورہ زبان کو بڑے لطیف اور وقار کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ منتخب کردہ موضوع کو اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ قارئین اس کی شگفتگی لطافت اور طنز و مزاح سے لطف اندوز ہوں۔ ظرافت کا پہلو اس حد تک نمایاں ہو کہ پڑھنے یا سننے والے کی زبان اور کان بار نہ محسوس کریں بلکہ پڑھنے والا اور سننے والے سب ہی تبسم ریز رہیں۔ اردو میں پطرس بخاری۔ رشید احمد صدیقی۔ فرحت اللہ بیگ۔ شوکت تھانوی۔ عظیم بیگ چغتائی۔ کنہیالال کپور اور فکر تونسوی نے اعلیٰ معیار کے مزاحیہ مضامین لکھے ہیں۔

فصاحت اور بلاغت

نثری یا شعری محاسن کو سمجھنے کے لئے جہاں اور کئی چیزوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ وہاں الفاظ کی فصاحت اور بلاغت کے بارے میں بھی جاننا ضروری ہے۔ اردو زبان کے طالب علم کو شعری یا نثری محاسن کے موضوع پر مطالعہ کے دوران فصیح، غیر فصیح۔ بلیغ، مبتذل، ثقیل، قبیح، اور ملیح، وغیرہ کے الفاظ سے بار بار واسطہ پڑتا ہے۔ اردو زبان کے یہ ایسے مخصوص الفاظ یا اصطلاحات ہیں جن کی تعریف جانے بغیر علم صرف، علم نحو، فنِ بلاغت۔ علمِ بیان (صنائع و بدائع) اور علمِ عروض وغیرہ کا مطالعہ ادھورا رہ جاتا ہے۔

"فصاحت اور بلاغت" کسے کہتے ہیں؟ ان کی واقفیت ہی کے ذریعہ نظم و نثر کی خوبیوں یا اس کی خامیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ نظم ہو یا نثر اس کی سلاست، روانی، برجستگی، تناسب لفظی، وزن، بندشِ الفاظ اور تراکیب کی دل آویزی وغیرہ کو دیکھنے کے بعد ہی یہ کہا جاتا ہے کہ یہ شعر "فصیح" ہے یا "غیر فصیح"۔

فصاحت اور بلاغت دو الگ الگ الفاظ ہیں ان کو ہم معنی سمجھنا غلط ہے۔

شبلی نعمانی موازنہ انیس و دبیر میں لکھتے ہیں کہ "علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے۔" الفاظ میں جو حروف آئیں ان میں تنافر نہ ہو، الفاظ نامانوس نہ ہوں، قواعد صرفی کے خلاف نہ ہوں۔ لغوی اعتبار سے فصاحت کے معنی "خوش گوئی" "تیز زبانی" اور کشادہ سخنی" کے ہیں مگر اصطلاحِ علمِ معانی میں "ثقیل" "مشکل" اور غیر مانوس الفاظ سے خالی ہونے کے ہیں۔ فصاحت کی تعریف چند بندھے ٹکے لفظوں میں کرنا مشکل ہے۔ بقول شبلی نعمانی "کوئی لفظ خود اپنی جگہ نہ فصیح ہے نہ غیر فصیح بلکہ محلِ استعمال اسے فصیح یا غیر فصیح بنادیتا ہے"۔ فصاحت کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ "وہ لفظ فصیح ہے جو بغیر سمجھائے ذہن میں آجائے"۔

مثال دیتے ہوئے شبلی نے اس کی واضح تعریف ان لفظوں میں کی ہے ۔" لفظ درحقیقت ایک قسم کی آواز ہے اور چونکہ آوازیں بعض شیریں، دل آویز اور لطیف ہوتی ہیں مثلاً طوطی و بلبل کی آواز اور بعض مکروہ اور ناگوار مثلاً کوے اور گدھے کی آواز، اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، بعض شستہ سبک، شیریں اور بعض ثقیل، بھدّے، ناگوار، پہلے قسم کے الفاظ کو "فصیح" کہتے ہیں اور دوسرے کو "غیر فصیح"۔ وہ الفاظ جو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں انھیں فنِ بلاغت کی اصطلاح میں "غریب" کہتے ہیں۔ شبلی نے فصاحت کے کئی مدارج بنائے ہیں۔ ایک ہی لفظ کہیں پر فصیح۔ کہیں پر فصیح تر اور کہیں پر اس سے بھی زیادہ فصیح تر درجہ رکھتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لفظ اپنی ہیئت اور معنویت کے اعتبار سے خواہ ثقیل ہو یا سادہ، عام زبان کا ہو یا ادبی، وہ فصیح ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ مناسب موقع پر برجستہ استعمال کیا گیا ہو۔ قصائد کے الفاظ پر آپ نے غور کیا ہوگا۔ اس کے الفاظ چونکہ پُرشکوہ ہوتے ہیں اس لئے بظاہر ثقیل معلوم ہوتے ہیں حالانکہ جن موقعوں پر اور جن تناسب کے ساتھ وہاں استعمال ہوتے ہیں وہ "فصیح" کا درجہ رکھتے ہیں۔

شبلی نعمانی نے "فصیح" اور "غیر فصیح" الفاظ کی وضاحت کے لئے انیس کے کلام کے تین مصرعوں کو پیش کیا ہے:۔ (۱) ع کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا۔

(۲) ع شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے۔

(۳) ع جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں۔

شروع کے دو مصرعوں میں "اوس" اور "شبنم" کے الفاظ آئے ہیں جو ہم معنی ہیں مگر "اوس" کی جگہ "شبنم" اور "شبنم" کی جگہ "اوس" لکھ دیا جائے تو فصاحت خاک میں مل جائے گی۔ اسی طرح تیسرے مصرعہ میں "جنگل" کے بجائے "صحرا" کا لفظ استعمال کیا جاتا تو وہ یقیناً "غیر فصیح" ہو جاتا۔ حالانکہ "جنگل" اور "صحرا" ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ مذکورہ بالا چاروں الفاظ اپنی انفرادی حیثیت سے خود بھی فصیح ہیں۔ شبلی نعمانی کے کہنے کے مطابق کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے ان کی ساخت، ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ ساتھ ان

کا خاص تناسب اور توازن بھی ہو ورنہ فصاحت قائم نہیں رہے گی۔ فصاحت کے متعلق ایک بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے کہ "چونکہ فصاحت کے یہ معنی ہیں کہ لفظ سادہ، آسان، کثیر الاستعمال ہو۔ اس لئے لوگ مبتذل اور سوقی الفاظ کو بھی فصیح سمجھتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں سفید اور سیاہ کا فرق ہے۔

خلاصہ یہ کہ جب کسی شعر یا مصرعہ کے تمام الفاظ میں ایک خاص قسم کی نسبت، موافقت وزن اور باہمی ترکیب پائی جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ مصرعہ یا شعر "فصیح" ہے ورنہ "غیر فصیح" مجموعی طور پر کلام کی اس خوبی کو کئی ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے مثلاً فصاحت، سلاست، بندشِ الفاظ، موزونیت، ترکیب کی دل آویزی، برجستگی، حسنِ بیان اور روانی وغیرہ۔

بلاغت:۔ بلاغت کے لغوی معنی ہیں "حسب موقع گفتگو کرنی" جیسا حال دیکھنا ویسی باتیں کرنا۔ "شمس الرحمن فاروقی نے " درسِ بلاغت " میں "بلاغت کیا ہے" کے عنوان سے لکھا ہے (۱) بلاغت کسی علم کا نام نہیں ہے بلکہ بلاغت ایک تصور ہے۔ بلاغت اس صورت حال کی تصوراتی شکل کو کہا جا سکتا ہے جو زبان کو حسن و خوبی کے ساتھ استعمال کرنے سے ظہور میں آتی ہے۔ (۲) بلاغت اس صورتِ حال کو کہتے ہیں جب کلام میں الفاظ معمولی زبان کے مقابلہ زیادہ زوردار اور خوبی کے حامل ہوں۔"

بلاغت دراصل قوتِ ترسیل کا نام ہے جو کسی سرگزشت، واقعہ، منظر یا جذبے کی کیفیت کو الفاظ کے ذریعہ پوری اصلیت اور تاثر کے ساتھ دوسروں تک پہنچا دے۔ علمائے ادب نے " طویل بات کو مختصر لفظوں میں ادا کر دینے کو بھی " بلاغت " کہا ہے۔ شاید اسی بنیاد پر مرزا غالب نے "مثنوی سحر البیان" اور مثنوی گلزار نسیم " کی زبان کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ " میر حسن فصاحت است " گلزار نسیم بلاغت است " نظم و نثر میں تشبیہات اور استعارے کے استعمال کے فن کو بھی بلاغت کہا گیا ہے۔ " بلاغت "چونکہ لفظی حسن کا نام ہے اس لئے شاعر اپنے کلام میں اس حسن کو مختلف طرح سے پیدا کرتا ہے مثلاً کلام میں کہیں تشبیہ یا لفظ کو حذف کر کے جیسے:۔ ؎

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا

(شہد کی مکھی باغ میں جاکر شہد بناتی ہے۔ جس سے موم نکلتا ہے۔ اسی سے موم بتی (شمع) تیار ہوتی ہے چونکہ پروانے اس پر اپنی جان قربان کر دیتے ہیں اس لئے شاعر انھیں بچانے کے لئے مگس کو باغ میں جانے سے روکتا ہے۔)

اس شعر میں موم کا لفظ کہیں نہیں آیا ہے جس کی وجہ سے شعر کو سمجھنے میں ذرا قباحت ہوتی ہے۔ فنِ شاعری میں اس طرح کی بلاغت کو "قبیح" کہتے ہیں۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی "بلاغت کی صورتِ حال الفاظ کے مناسب ترین استعمال سے ہی پیدا ہوتی ہے اس کا تعلق بلند جذبات، عمیق افکار یا جذبات کے خلوص سے نہیں ہے"

خلاصہ یہ ہے کہ الفاظ کے داخلی حسن کے بجائے اس کے خارجی حسن کا نام ہی "بلاغت" ہے۔ جن کا تفصیلی ذکر "علمِ نحو"۔ "علمِ بیان"۔ "علمِ بدیع"۔ "علمِ عروض" اور "علمِ قافیہ" کے تحت ہوتا ہے۔

بلاغت اور فصاحت کا فرق :- جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے بلاغت اور فصاحت الگ الگ لفظ ہیں یہ نہ تو ہم معنی ہیں اور نہ ہی دونوں کا ایک ساتھ کلام میں موجود ہونا ضروری ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کلام میں فصاحت کے بغیر بلاغت اور بلاغت کے بغیر فصاحت پائی جاتی ہو۔ اس کی تصدیق مصحفی کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے۔ ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا - ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

اس شعر کا دوسرا مصرعہ برجستہ ہونے کی وجہ سے "فصیح" بھی ہے اور "بلیغ" بھی۔ مگر اس کے پہلے مصرعہ میں "غزل چھیڑنے" کی ترکیب نامانوس ہے۔ جیسا کہ محترمہ سالکہ خاتون صاحبہ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے "غزل گائی جاتی ہے چھیڑی نہیں جاتی"۔ ہاں اس کی جگہ "ساز چھیڑنا"۔ "راگ چھیڑنا"۔ "نغمۂ وفا چھیڑنا" ہوتا تو فصیح تر کہلاتا۔ اس طرح مصحفی کا یہ شعر "فصاحت" سے عاری مگر "بلاغت" سے بھرپور ہے۔

الغرض "فصاحت اور بلاغت" کے اس ذکر سے یہ نتیجہ نکلا کہ نظم ہو یا نثر اسے لفظی حسن سے آراستہ اور معنوی خوبیوں سے پیراستہ کرنے کے لئے فصاحت اور بلاغت دونوں سے کام لینا چاہئے۔

علمِ بیان اور علمِ عروض

اس کتاب کے حصہ اوّل میں بتایا گیا ہے کہ اردو قواعد کو موضوعات کے لحاظ سے پانچ حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ علم ہجا، علم صرف، علم نحو، علم بیان، اور علم عروض۔ ان میں سے پہلے تین" علم ہجا"، "علم صرف"، "علم نحو" کے بارے میں اس کتاب کے حصہ اوّل میں بتایا جاچکا ہے۔ صنائع و بدائع دراصل شعری محاسن ہیں اس سے قبل کہ ہم ان کے مفہوم و معنی کا ذکر کریں۔ علمِ بیان اور علمِ عروض کا جاننا ضروری ہے۔

علمِ بیان :- کلام میں خوبصورتی اور لطافت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب بات کرنے والے کو اپنے مطلب کی ادائیگی پر پورا پورا عبور ہو۔ وقت اور ضرورت کے مطابق ایک معمولی سی بات کو بھی مختلف انداز سے پیش کر کے اس کو پُراثر اور پُرلطف بنایا جاسکتا ہے۔ کہیں تشبیہ، کہیں استعارہ، کہیں لغوی معنی تو کہیں پر مجازی معنی لے کر زورِ بیان کو بڑھایا جاتا ہے۔ اسی اسلوبِ بیان کو ہم " علم بیان" کہتے ہیں۔

"علم بیان" میں الفاظ کے معنی سے بحث کی جاتی ہے۔ ایک ہی لفظ مختلف جگہوں پر مختلف معنی و مفہوم دیتے ہیں۔ اس طرح تشبیہ، استعارہ، مجاز، اور کنایہ وغیرہ علم بیان کے دائرے میں آتے ہیں۔ " علمِ بیان" شعری محاسن کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں مدد کرتا ہے۔

علم عروض :- علم عروض ایک فن ہے جس سے اشعار کا وزن یعنی اس کے موزوں یا ناموزوں ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ علم عروض کا موجد خلیل ابن احمد ہے جو عرب کا رہنے والا تھا۔ اس نے شاعری میں پندرہ اوزان مقرر کئے اور ہر وزن کا نام "بحر" رکھا۔ مثلاً بحرِ رمل، بحرِ رجز اور بحرِ کامل وغیرہ۔

علم عروض کا جاننے والا شعر کے دونوں مصرعوں کے وزن کو دیکھ کر یہ بتا سکتا ہے کہ

یہ شعر موزوں ہے یا غیر موزوں۔ شعری وزن ناپنے کے طریقے کو "تقطیع" کہتے ہیں۔ تقطیع کے معنی ہیں "ٹکڑے ٹکڑے کرنا"۔ چونکہ شعر کے الفاظ کو ارکانِ بحر کے مطابق جانچنے یا تولنے کے لئے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاتے ہیں اسی لئے اس کا نام "تقطیع" ہے۔

تقطیع کے ذریعہ شعر کے اجزا کو بحر کے ارکان پر اس طرح وزن کرتے ہیں کہ ساکن کے مقابل ساکن اور متحرک کے مقابل متحرک حرف ہو جیسے۔

۱۔ مقدور نہیں اس کی تجلّی کے بیاں کا — جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

تقطیع :۔ (متحرک بحر)

	مفعولُ	مفاعیلُ	مَفاعیلُ	فعولُنْ
پہلا مصرعہ	مقدور	نہی اس کِ	تجل لی کِ	بیا کا
دوسرا مصرعہ	جو شمع	سراپا، ہُ	اگر صرف	زبا کا

۲۔ لبِ بام کثرت جو بکھر ہوئی — تلے کی زمیں ساری اوپر ہوئی

تقطیع :۔ (ساکن بحر)

	فعولُنْ	فعولُنْ	فعولُنْ	فعَل
پہلا مصرعہ	لبے با	م کثرت	جُ بکھر	ہُ ئی
دوسرا مصرعہ	تلے کی	زمی سا	رِ اوپر	ہُ ئی

شعر کا وزن معلوم کرنے کے لئے کچھ ارکان مقرر کئے گئے ہیں۔ ان ارکان کی تکرار سے جو خاص وزن پیدا ہوتا ہے اُسے "بحر" کہتے ہیں۔ مثلاً

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں پھر منہ میں زباں کیوں ہو (غالب)

اس شعر کے ہر مصرع کا وزن "مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن، مفاعیلن" ہے۔ بحر کا تعین دونوں مصرعوں کے ارکان کی مجموعی تعداد کی مناسبت سے کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر شعر کے دونوں مصرعوں میں کل ملا کر آٹھ ارکان ہوں تو "بحر مثمن" اور چھ ارکان ہوں تو "بحر مسدس" کہلائے گی۔

صنائع و بدائع

خوب سے خوب تر کی تلاش انسانی فطرت ہے۔ چنانچہ خوبصورت اور اچھی چیز کو بھی انسان طرح طرح سے آراستہ کر کے اس کے حسن کو مزید چار چاند لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح شعرا بھی اپنے کلام کو صرف شعری وزن اور دیگر ضروریاتِ شعری سے ہی آراستہ نہیں کرتے بلکہ لفظی اور معنوی خوبیوں کے ذریعہ بھی شعر میں حسن پیدا کرتے ہیں۔ شعر میں حسن پیدا کرنے کے اس طریقے کو ہم "صنائع و بدائع" کہتے ہیں۔

جس طرح انسانی حسن میں مزید اضافہ کے لئے زیورات اور عمدہ لباس کا استعمال ہوتا ہے اسی طرح شعرا اپنے کلام میں مزید خوبصورتی اور لطف پیدا کرنے کے لئے صنائع و بدائع سے کام لیتے ہیں۔ جس علم میں صنائع و بدائع کی بحث کی جاتی ہے اسے "علم بدیع" یا "علم بلاغت" کہتے ہیں۔ صنائع "صنعت" کی جمع ہے اور بدائع "بدیع" کی۔ بدائع کے معنی ہیں "نادر اور بے مثل چیزیں"۔ لفظی خوبیوں کو "صنائع" اور معنوی خوبیوں کو "بدائع" کہتے ہیں۔ اس طرح صنائع و بدائع کی دو قسمیں ہیں:۔

۱۔ صنائع معنوی ۲۔ صنائع لفظی

صنائع معنوی:۔ کلام میں ایسے الفاظ کا لانا جن سے کلام کی معنوی خوبیاں بڑھ جاتی ہوں اسے "صنائع معنوی" کہتے ہیں۔ صنائع معنوی کی تقریباً بائیس ۲۲ قسمیں ہیں لیکن ذیل میں صرف انھیں اقسام کا ذکر کیا گیا ہے جو آپ کے نصاب میں شامل ہیں یا زیادہ مستعمل ہیں۔

صنائع لفظی:۔ ایسے الفاظ جو کلام کے صرف لفظی حسن کو بڑھاتے ہیں "صنائع لفظی" کہلاتے ہیں۔ علمائے ادب نے اس کی تقریباً ہجنیس قسمیں لکھی ہیں لیکن ذیل میں صرف آٹھ کا ذکر کیا گیا ہے۔

اقسام صنائع معنوی

۱۔ صنعتِ تضاد

شعر کے ایک ہی یا دونوں مصرعوں میں ایسے الفاظ کا لانا جو آپس میں متضاد ہوں اسے "صنعتِ تضاد" کہتے ہیں۔ جیسے:۔

۱۔ طولِ غمِ حیات سے گھبرا نہ اے جگرؔ
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہ ہو (جگرؔ)

(شام۔ سحر)

۲۔ دن کا کیا ذکر تیرہ بختوں میں
ایک رات آئی ایک رات گئی (جگرؔ)

(دن۔ رات) (آئی۔ گئی)

۳۔ درد منّت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا (غالبؔ)

(اچھا۔ بُرا)

۲۔ صنعتِ ایہام

ایہام کے اصل معنی "شک" یا "وسوسہ" میں ڈالنا ہے۔ کلام میں اس طرح کا لفظ لانا جس کے دو معنی نکلتے ہوں اور دونوں سے شعر کے الگ الگ مطلب بھی نکالے جا سکتے ہوں۔ اسے "صنعتِ ایہام" کہتے ہیں۔ قدیم شعرا کے یہاں صنعتِ ایہام کا استعمال ایک فن مانا جاتا تھا۔ خاص طور سے ولیؔ دکنی کے کلام میں صنعتِ ایہام کی بہتات ہے۔

۱۔ اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں
عارضی میری زندگانی ہے (ولیؔ)

عارضی کے دو معنی ہیں ا۔ (عارضی۔ تھوڑے وقت کے لئے۔ جو دیر پا نہ ہو۔ ۲(عارض بمعنی رخسار اسی سے عارضی بنایا گیا ہے) یعنی جس زندگی کا انحصار صرف اس کے عارض کو دیکھنے پر ہی ہو)

۵ قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت

بعد مرنے کے میری توقیر آدھی رہ گئی (امانت)

(۱) "نیم" بمعنی آدھا۔ (۲) نیم ایک درخت کا نام ہے جس کے پھل اور پتے بہت کڑوے ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کا شمار حقیر درختوں میں ہوتا ہے۔ اس شعر میں لفظ "نیم" نے صنعتِ ایہام کی خوبی پیدا کی ہے۔

۳۔ مراعاتُ النظیر

یہ لفظ مرکب ہے۔ مراعات + نظیر اس کے معنی ہیں "رعایت کرنا" یا "جمع کرنا" اس طرح کی چیزوں کے نام کو جن میں باہمی مناسبت ہو مثلاً (برگ، گل، خار) یا (تیر، تفنگ، کمان وغیرہ)۔ کلام میں مراعاتُ النظیر سے مراد ایسی چیزوں کا ذکر کرنا ہے جن میں آپسی مناسبت یا تعلق پایا جائے۔ مثال:۔

لہ خط بڑھا، زلفیں بڑھیں، کاکل بڑھے، گیسو بڑھے

حُسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے (ذوق)

خط، زلفیں، کاکل اور گیسو میں باہمی مناسبت پائی جاتی ہے۔ (سرکار بمعنی مملکت اور "ہندو" بمعنی "کالا") مذکورہ بالا چاروں بڑھنے والی چیزیں کالی ہیں)

۵ جو ٹیکہ صندل کا ہے جبیں پر تو پاس ابرو کے خال بھی ہے

سپہر خوبی پہ بدر بھی ہے، سہیل بھی ہے ہلال بھی ہے

پہلے مصرعہ میں ٹیکہ جبیں، ابرو، خال اور دوسرے مصرعہ میں سپہر، بدر، سہیل اور ہلال ایسے الفاظ ہیں جن میں باہم مناسبت ہے۔ اس کے علاوہ ٹیکہ کو بدر سے جبیں کو سپہر سے، ابرو کو ہلال سے اور خال کو سہیل سے مشابہت دی گئی ہے۔

۴۔ حسنِ تعلیل

"تعلیل" کے لغوی معنی ہیں" دلیل دینا" وجہ بیان کرنا"۔ صنائعِ معنوی کی یہ ایک قسم ہے جس میں شاعر کسی بات کا وہ سبب بیان کرتا ہے جو حقیقت میں اس کا سبب نہیں ہوتا جیسے :۔ ۱؎

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

ساحل سے موجوں کا ٹکرانا کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن شاعر نے یہاں ایک نئی وجہ بتاتے ہوئے اس شعر میں جدت پیدا کی ہے کہ حضرت امام حسینؓ اور ان کے رفقاء پر تین شب و روز سے پانی بند ہے اس لئے ان کے غم میں موجیں تڑپ تڑپ کر ساحل سے اپنے سر کو ٹکرا رہی ہیں۔

۲؎ خدا جانے صبا ہر روز کیا پیغام لاتی ہے
کہ بہروں کانپتے رہتے ہیں تنکے آشیانوں کے

ہوا کے ساتھ آشیانے کے تنکوں کا ہلنا لازمی بات ہے مگر شاعر کہتا ہے کہ نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ صبا (ہوا) اپنے ساتھ نہ معلوم کون سا پیغام لاتی ہے جس کو سن کر تنکے خوف سے کانپنے لگتے ہیں۔ یاد رہے کہ شعراء نے اردو ادب میں صبا کو" پیغامبر" کہا ہے۔

۵۔ لف و نشر

لف کے معنی" لپیٹنا" ہے۔ اسی سے لفظ" لفافہ" بنا ہے" نشر" کے معنی ہیں" بکھرا ہوا" "لف و نشر" کے معنی ہوئے" بکھرے ہوئے کو لپیٹنا"۔

کلام میں پہلے چند چیزوں کا لانا" لف" کہلاتا ہے اور پھر ہر ایک کی مناسبت کو بیان کرنا" نشر" کہلاتا ہے۔ اگر بعد میں یعنی دوسرے مصرعہ میں آنے والی اشیاء کی ترتیب

پہلے مصرعہ میں آنے والی اشیاء کی ترتیب کے مطابق ہے تو لف ونشر مرتب" کہلاتا ہے ورنہ "لف ونشر غیر مرتب" ذیل میں "لف ونشر مرتب" اور "لف ونشر غیر مرتب" دونوں کی مثالیں دی گئی ہیں :-

شعر ۱ شرکتِ شیخ و برہمن سے میرؔ — کعبہ و دیر سے بھی جائے گا

شعر ۲ تیرے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار
گل جدا سرو جدا نرگسِ بیمار جدا

ان اشعار کے دونوں مصرعوں میں آنے والی اشیاء کی ترتیب ایک جیسی ہے اس لئے اوپر کے دونوں اشعار "لف ونشر مرتب" ہیں۔ اس کے برعکس ذیل کے شعر میں "لف" کی ترتیب "نشر" کی ترتیب سے مختلف ہے اس لئے یہ "لف ونشر غیر مرتب" کہلائے گا :-

شعر ۳ باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے (غالبؔ)

۶۔ صنعتِ مبالغہ

کلام میں کسی چیز کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا "صنعتِ مبالغہ" کہلاتا ہے۔ شعر میں زورِ بیان کو بڑھانے کے لئے مبالغے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کے شعرا خصوصاً میر انیسؔ نے اپنے مرثیوں میں صنعتِ مبالغہ کا کثرت سے استعمال کیا ہے مبالغہ کی تین قسمیں ہیں :-

۱۔ تبلیغ :- وہ مبالغہ جو عقل اور عادت دونوں کے قریب ہو مثلاً کسی مجمع میں آدمیوں کی کثیر تعداد کو ظاہر کرنے کے لئے اکثر کہا جاتا ہے :- " وہاں پر ہزاروں کا مجمع تھا "۔ (گنتی کے اعتبار سے چاہے وہاں ایک ہزار آدمی بھی نہ ہوں۔)

شعر وعدۂ شام پہ کی ہم نے عبث جاگ کے صبح
وہ اسی وقت نہ آتے جو نہ آنا ہوتا

۲۔ اغراق :- مبالغہ کی وہ بات جس کو عقل تو قبول کرتی ہو۔ لیکن عادتاً ایسا نہ

ہو۔ جیسے :۔

۱۔ زرہیں تنوں میں مثلِ کفن چاک ہو گئیں
اک آن میں صفیں کی صفیں خاک ہو گئیں

۲۔ " وہاں تو تِل رکھنے کی جگہ نہ تھی " ۔

۳۔ غلو :۔ وہ بات جو عقلاً اور عادتاً دونوں اعتبار سے ناممکن ہو جیسے :۔

۱۔ گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر (انیس)

۲۔ کیا نزاکت ہے جو توڑا شاخِ گل سے کوئی پھول
آتشِ گلُ سے پڑے چھالے تمہارے ہاتھ میں (امیر مینائی)

۷۔ صنعتِ تلمیح

کلام میں کسی مشہور واقعہ یا کسی مذہبی روایت کی طرف اشارہ کرنے کو "تلمیح" کہتے ہیں۔ تلمیح کے الفاظ بظاہر مختصر ہوتے ہیں لیکن اُس کے پیچھے وہ پورا قصہ ہوتا ہے جس کی طرف شاعر اشارہ کرنا چاہتا ہے۔ اس پورے قصہ کو جانے بغیر نہ تو شعر کا مطلب بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ ہی شعر کے اندر لائی گئی صنعتِ تلمیح کا پورا پورا لطف اٹھایا جاسکتا ہے ۔

تلمیحی اشعار :۔ ۱۔ گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

۲۔ نارِ نمرود کو کیا گلزار دوست کو یوں بچا لیا تو نے

۳۔ بازارِ دہر میں تیری منزل کہاں نہ تھی
یوسف نہ جس میں ہو کوئی ایسی دوکاں نہ تھی

مذکورہ بالا اشعار میں "طور"، "نارِ نمرود"، "یوسف" تلمیحات ہیں۔

۸۔ صنعتِ توجیہہ

جب کلام میں مدح و ذمّ دونوں ہوں یا کسی بات کے سلسلہ میں دو مختلف معنی دیتے ہوں اور مطلب کے اعتبار سے یہ دونوں مختلف معنی ہم پلہ ہوں یعنی ایک مطلب کو دوسرے مطلب پر ترجیح نہ دی جا سکے۔ جیسے :۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا (غالبؔ)

اس شعر کے مطلب کی پہلی صورت میں گھر کی آبادی ثابت ہوتی ہے اور دوسری صورت میں اس کی ویرانی کا اظہار ہوتا ہے۔

۹۔ تجاہلِ عارفانہ

یہ بھی صنائع معنوی کی ایک قسم ہے۔ کلام میں کسی ایسی بات کا اظہار کرنا جس کے متعلق شاعر جان کر بھی انجان بنتا ہے۔ جیسے :۔

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی (غالبؔ)

دوسرے مصرعہ میں غالبؔ نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محبوب کی یاد میں انھیں نیند رات بھر نہیں آتی۔ پھر بھی انجان بنتے ہیں۔

اقسامِ صنائع لفظی

۱۔ صنعتِ تجنیس

ــ تمہاری مانگ ہی دل مانگ لے گی + یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے

تجنیس کے لغوی معنی ہیں "ایک جیسا" یا "یکساں"۔ یہ صنائع لفظی کی ایک قسم

ہے جس سے مراد ہے کلام میں ایسے الفاظ کا لانا جو بظاہر ایک جیسے ہوں لیکن معنی کے اعتبار سے مختلف ہوں جیسے :۔

ل

کہا دل نے میرے دیکھی جو وہ مانگ
کہ ہے یہ رات آدھی کچھ دعا مانگ

تجنیس تام :۔ شعر میں دو ایسے الفاظ کا آنا جو تعداد، ترتیب، حرکت اور سکون میں یکساں ہوں۔ جیسے اوپر کے شعر میں لفظ "مانگ" اس کی دو قسمیں ہیں :۔

(ا) **تجنیس تام مماثل :۔** قواعد کے اعتبار سے دونوں الفاظ یکساں یعنی اسم، فعل یا حرف ہوں۔

(ا ا) **تجنیس تام مستوفی :۔** دونوں الفاظ میں یکسانیت نہ ہو یعنی ایک اسم ہو تو دوسرا فعل جیسا کہ اوپر کے شعر میں پہلا "مانگ" اسم ہے تو دوسرا فعل

۲۔ صنعتِ سیاقتہ الاعداد

وہ صنعتِ شعری جس سے کلام میں اعداد کا ذکر پایا جاتا ہو اس میں ترتیب وغیرہ کی ضرورت نہیں ہوتی جیسے :۔

کشتے تھے ایک ضرب میں دو ہو کہ چار ہوں
ششدر تھے سب کہ موت سے کیونکر دوچار ہوں

۳۔ صنعتِ توشیح

اس صنعت میں اشعار اس طرح لکھے جاتے ہیں کہ شعر کے تمام مصرعوں کے پہلے لفظ کا پہلا حرف شعر کی ترتیب کے لحاظ سے ایک ساتھ ملا کر لکھا جائے تو ان سے کوئی نام یا عبارت بن جائے جیسے :۔

ناظمِ مملکت جاہ و جلال
وارثِ تاج و سر برِ اقبال

آفتاب فلک جاہ و حشم

بدر تابندۂ الطاف و کرم

(ن + و + ا + ب = نواب ــــ)

۴۔ صنعتِ تنسیق الصفات

جب کلام میں کسی چیز یا فرد کی متعدد اور مسلسل خوبیاں بیان کی جائیں تو اسے "صنعتِ تنسیق الصفات" کہتے ہیں۔ جیسے:۔

ــلہ کہ واں اک جواں تھا پرس رام نام
خوش اندام، وخوش قامت وخوش خرام

ــلہ خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع، ماہ پیکر
نازک بدن، شکرلب، شیریں ادا، فسوں گر (جوش)

۵۔ صنعتِ مُہملہ

صنعتِ لفظی کی اس قسم کو "صنعتِ غیر منقوط" بھی کہتے ہیں یعنی ایسی عبارت یا نظم جس میں نقطہ والے حروف نہ آئیں۔ مرزا دبیرؔ کا ایک مرثیہ اسی صنعت میں ہے۔ ع۔ "مہر علم سرور اکرم ہوا طالع" انشاؔ کا ایک پورا دیوان، ایک مثنوی اور ایک قصیدہ جس کا نام "طور الکلام" ہے اسی صنعت میں ہے۔ ـــ

اور کسی کا آسرا ہو سر گروہ اس راہ کا
آسرا اللہ اور آلِ رسول اللہ کا

۶۔ صنعتِ سجع

جب کلام میں پہلے فقرہ اور دوسرے فقرہ کا آخری حرف یکساں ہو تو اُسے "صنعتِ سجع" کہتے ہیں اس کی تین قسمیں ہیں:۔

(ا) سجع مطرف :۔ دو فقروں یا مصرعوں کے آخری لفظ ہم وزن تو نہ ہوں مگر آخری حرف یکساں ہوں ۔ جیسے :۔

۱؎ طاق سے تو اتار لے شیشہ   طاق پر دھر کتاب اندیشہ

۲؎ "بخیل وہ ہے جو آپ کھائے نہ اوروں کو کھلائے"۔

(ب) سجع متوازن :۔ دو فقروں یا مصرعوں میں وزن تو ہو مگر آخری حرف یکساں نہ ہوں ۔ جیسے :۔ ۱؎ بخت ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں

چرخ کج باز نے سوچا کہ کرے مجھ کو ذلیل

(س) سجع متوازی :۔ صنعتِ سجع کی وہ قسم ہے جس میں دونوں فقروں یا مصرعوں میں وزن بھی ہو اور آخری حرف یکساں بھی ہو ۔ جیسے :۔

؎ حسنِ مہ گرچہ بہنگام کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

۷۔ صنعتِ معمّا

یہ بھی صنعتِ لفظی کی ایک قسم ہے ۔ شعری جدّت کا کمال اس صنعت میں دیکھنے کو ملتا ہے اس میں شعر کے اندر شاعر لفظی اشارہ یا حرفی دلالت کے ذریعہ کوئی نام یا عبارت لاتا ہے جو حیرت میں ڈالنے والی ہوتی ہے مثلاً مومن نے "مہتاب رائے" کا معما اس طرح نکالا ہے :۔

۱؎ ہے کیوں کر کہ ہے سب کار الٹا
"ہم الٹے بات الٹی یار الٹا"

(مومن)

ہم کا الٹا مہ ۔ بات کا الٹا تاب ۔ یار کا الٹا رائے ۔ ان تینوں الفاظ کو الٹنے کے بعد (مہ + تاب + رائے) "مہتاب رائے" بن گیا۔

صنعتِ اشتقاق : اشتقاق لفظ مشتق سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ایک مصدر سے کئی الفاظ بنانا مثلاً ؎ اے بخت تو جاگ اور جگا ہم کو کہ پھر : جاگیں گے نہ تا حشر جگائے سے کسو کے

خط کشیدہ الفاظ "جاگنا" مصدر سے مشتق کیے گئے ہیں ۔ اس خوبی کو "صنعتِ اشتقاق" کہتے ہیں ۔

علم البیان

علم بیان کی تعریف میں پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ وہ علم ہے جس میں کلام کی ان خوبیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو شعر و شاعری کے لئے ضروری تو نہیں ہوتے لیکن شعری حسن کو چار چاند لگانے میں کافی مددگار ہوتے ہیں۔ انھیں خوبیوں کو "علم البیان" کی اصطلاح میں "صنائع و بدائع" کہتے ہیں۔ کلام کی لفظی خوبیوں کو "صنائع" اور معنوی خوبیوں کو "بدائع" کہتے ہیں۔ صنائع کا مطالعہ ہم "علم بلاغت" کے دائرے میں کرتے ہیں جب کہ "بدائع" کا "علم بیان" میں شعراء دادتا بہت سے الفاظ کو مختلف جگہوں پر مختلف معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کہیں تشبیہہ، کہیں استعارہ تو کہیں لغوی یا مجازی معنی پیش کر کے کلام کے زورِ بیان اور اس کے حسن کو بڑھاتے ہیں۔ اسی فن کا مطالعہ "علم البیان" میں کیا جاتا ہے۔ ان کے ذریعہ کلام فصیح و بلیغ کی لفظی و معنوی خوبیوں کو پرکھا جاتا ہے۔ تشبیہہ، استعارہ، مجاز، کنایہ اور رمز وغیرہ "علم البیان" کے دائرے میں آتے ہیں۔ علم البیان میں لفظ کے معنی کو "دلالت" کہتے ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں:-

۱۔ **دلالت حقیقی**:- جس لفظ سے حقیقی معنی مراد ہوں۔

۲۔ **دلالت التزامی**:- لغوی معنی کے علاوہ جب لفظ کو دوسرے معنوں میں بھی استعمال کیا جائے تو اسے "دلالت التزامی" کہتے ہیں۔ جیسے شیر سے اگر جنگل کا خونخوار جانور مراد ہے تو یہ دلالت حقیقی ہوا۔ بصورت دیگر اگر بہادر شخص کے لئے استعمال کیا گیا ہے تو یہ "دلالت التزامی" کہلائے گا۔ اس وضاحت کے بعد یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ علم بیان یا علم بدیع کا تعلق

"دلالت التزامی" سے ہے۔ دلالت التزامی کی بھی دو قسمیں ہیں:۔(۱) مجاز (۲) کنایہ

مجاز:۔ جب کسی لفظ کے التزامی یعنی مجازی معنی مراد ہوں اور حقیقی معنی سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو تو اسے "مجاز" کہتے ہیں جیسے:۔ ع ۔"کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے"، یہاں شیر سے مراد بہادر آدمی سے ہے۔

کنایہ:۔ کنایہ کے معنی ہیں بات کو پوشیدہ ڈھنگ سے کہنا۔ وہ لفظ جس کے مجازی معنی مراد ہوں اور وہ حقیقی معنی میں بھی لیا جا سکتا ہو اسے "کنایہ" کہتے ہیں جیسے "قندیلِ فلک" سے مراد چاند ہے۔ مثال ؎ لہر چڑھ رہی ہے کالوں کی

تو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی

کالے سے مراد کالا ناگ ہے جو یہاں کنایہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

کنایہ اور مجاز میں فرق:۔ مجاز میں صرف ایک التزامی (مجازی) معنی مراد ہوتے ہیں جب کہ کنایہ میں مجازی اور حقیقی دونوں معنی مراد لئے جا سکتے ہیں۔

رمز:۔ کنایہ کی یہ ایک قسم ہے جس میں لازم و ملزوم کے بیچ کوئی واسطہ تو نہ ہو مگر ہاں تھوڑی پوشیدگی ضرور ہو جیسے:۔ "کوتاہ گردن" سے مراد "کینہ رکھنے والا" سمجھا جاتا ہے۔

استعارہ:۔ یہ مجاز کی ایک قسم ہے۔ استعارہ لفظ مستعار سے بنا ہے جس کے معنی ہیں "ادھار لینا"، لیکن علم بیان کی اصطلاح میں لفظ کو اس کے اصلی معنی کے علاوہ کسی دوسرے معنی میں استعمال کرنے کو "استعارہ" کہتے ہیں بشرطیکہ ان دونوں معنوں میں تشبیہی تعلق ہو جیسے بہادر کے "شیر"۔ معشوق کے لئے "گل" خوش کلام کے لئے "بلبل" وغیرہ مثلاً حالی نے مرزا غالب کے لئے کہا ہے:۔ ؎

"بلبل ہند مر گیا ہیہات"

جس کے تھی بات بات میں اک بات

؎ چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی۔ نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

مندرجہ بالا مثالوں میں یہاں "چھوٹے سے چاند" سے مراد "جگنو" ہے "شیر" "گل"

"بلبل ہند" اور "چھوٹے سے چاند" کو بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان الفاظ کے لغوی اور مجازی معنوں میں تشبیہی تعلق پایا جاتا ہے جو استعارہ کے لئے ضروری ہے۔ استعارہ میں نے حسب ذیل چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) مستعار منہٗ :- وہ چیز جس سے کچھ مانگا جائے۔

(۲) مستعار لہٗ :- وہ چیز جس کے لئے مانگا جائے۔

(۳) مستعار :- وہ چیز جو مانگی گئی۔ مثلاً نبیل کو اس کی بہادری کی وجہ سے "شیر" کہہ کر مخاطب کریں تو شیر "مستعار منہٗ" نبیل "مستعار لہٗ" اور بہادری "مستعار" کہلائے گی۔ چونکہ نبیل اور شیر کی بہادری میں تشبیہی تعلق ہے اس لئے "شیر" "استعارہ" کہلائے گا۔ استعارہ کی دو قسمیں ہیں :-

(۱) استعارہ بالتصریح :- اس استعارہ کو کہتے ہیں جس میں مستعار منہٗ (مشبہ بہ) کا ذکر تو ہو مگر مستعار لہٗ (مشبہ) کا ذکر نہ ہو جیسے :- ؎ ربط رہنے لگا اس شمع کو پروانوں سے،
اس مصرعہ میں صرف شمع اور پروانوں کا ذکر تو ہے مگر عاشق معشوق کا نہیں۔

(۲) استعارہ بالکنایہ :- اس استعارہ کو کہتے ہیں جس میں مستعار منہٗ (مشبہ بہ) کا ذکر تو نہ ہو مگر مشبہ بہ کے مناسبات اور لوازمات کا ذکر ضرور کیا گیا ہو مثلاً :- ؎ "نہیں ممکن کہ کلکِ فکر لکھے شعر سب اچھے" اس مصرعہ میں "فکر" کو منشی سے تشبیہ دی گئی ہے اور مشبہ بہ (مستعار منہٗ) یعنی منشی کا کوئی ذکر نہیں ہے ہاں چونکہ کلک کا ہونا منشی کے لئے ضروری ہے اس لئے اس کا ذکر کیا گیا ہے طرفین کے اجتماع کے لحاظ سے استعارہ کی دو قسمیں ہیں :-

(۱) استعارہ وفاقیہ :- اگر طرفین استعارہ یعنی مستعار لہٗ اور مستعار منہٗ ایک جگہ یا ایک شخص میں ہوں تو ایسے استعارہ کو "استعارہ وفاقیہ" کہتے ہیں جیسے :-

؎ نکلنے کا رستہ نہ بچنے کی جا ہے   کوئی اس میں سوتا کوئی جاگتا ہے۔

اس شعر میں "سوتا" غفلت کے لئے اور "جاگتا" بیداری اور ترقی کے لئے بطور "استعارہ وفاقیہ" استعمال ہوا ہے کیونکہ ایک شخص میں سونا (غفلت) اور جاگنا

(غفلت سے بیدار ہونا) دونوں صفات کا ایک جگہ ہونا عین ممکن ہے۔

(۲) استعارہ عنادیہ :- ایسے استعارہ کو کہتے ہیں جس میں مستعار لہٗ اور مستعار منہ کا ایک شخص میں جمع ہونا ممکن نہ ہو جیسے کسی بزدل کے لئے طنزیہ کہا جائے کہ "آج ہمارا شیر بھی گھر سے نکل پڑا۔

مثال ۲؎ وہاں تو سیم و زر ان کی نظر میں خاک ہیں
یہاں ہم ایسے تو انگر کہ گھر میں خاک نہیں

اس شعر میں "تو انگر" مفلسی کے معنی میں بطور "استعارہ عنادیہ" استعمال ہوا ہے کیونکہ مفلسی اور تو انگری دونوں بیک وقت ایک شخص میں نہیں جمع ہو سکتیں۔

مجاز مرسل :- جب کسی لفظ کے حقیقی معنی کو ترک کر کے اس کو صرف مجازی معنی میں استعمال کیا گیا ہو اور اس کے حقیقی و مجازی معنوں میں تشبیہی تعلق نہ ہو، بلکہ کسی دوسرے طرح کا تعلق ہو جیسے جز و کل یا ظرف مظروف وغیرہ تو اسے "مجاز مرسل" کہتے ہیں۔ مثلاً :- "نالا بہہ رہا ہے" "ہانڈی پک گئی"۔ ان مثالوں میں "نالا" "ہانڈی" سے مراد پانی اور سالن ہے۔ مجاز مرسل کی بہترین مثال ذیل کے اشعار میں دیکھئے :- ؎

میری زندگانی ترے ہاتھ ہے
میری آبرو ترے ہاتھ ہے

۲؎ جب ہاتھ اس کی نبض پر رکھا طبیب نے
محسوس یہ کیا کہ بدن میں لگی ہے آگ

یہاں پر "میری آبرو ترے ہاتھ ہے"۔ "بدن میں لگی ہے آگ" مجاز مرسل ہیں۔

استعارہ اور مجاز مرسل میں فرق :- لفظ کے حقیقی و مجازی معنوں کے درمیان اگر تشبیہی تعلق ہے تو وہ "استعارہ" کہلائے گا ورنہ "مجاز مرسل" جیسا کہ مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہے۔

تشبیہ :- تشبیہ کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو کسی چیز کے مشابہ یا ہم شکل قرار دینا۔ مثلاً :- "یاقوت جیسے ہونٹ" "چاند سا چہرہ" "پتھر جیسا دل"۔ وغیرہ۔ تشبیہ میں مندرجہ ذیل چار ارکان کا ہونا ضروری ہے جن کی وضاحت

مذکورہ بالا مثالوں کے ذریعہ کی گئی ہے۔

(i) مشبہ :- جس چیز کو تشبیہہ دی جائے مثلاً اوپر کی مثالوں میں ہونٹ، چہرہ، دل مشبہ ہیں

(ii) مشبہ بہ :- وہ چیز جس سے تشبیہہ دی جائے مثلاً 〃 یاقوت، چاند، پتھر مشبہ بہ ہیں

(iii) حرف تشبیہہ :- وہ لفظ جس سے معلوم ہو کہ تشبیہہ دی گئی 〃 جیسے۔ سا۔ جیسا

(iv) وجہ تشبیہہ : وہ وصف جس کے لئے تشبیہہ دی گئی ہے 〃 مثلاً ہونٹ کی سرخی، چہرے کی خوبصورتی، دل کی سختی کے لئے مذکورہ بالا تشبیہیں دی گئی ہیں۔

تشبیہ کی قسمیں

۱۔ تشبیہہ مرسل :- وہ تشبیہہ جس میں حرف تشبیہہ موجود ہو جیسے۔

؎ حقہ جو ہے حضور معلی کے ہاتھ میں — گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

۲۔ تشبیہہ موکدہ :- وہ تشبیہہ جس میں حرف تشبیہہ نہ ہو جیسے۔

؎ چشم پُر آب اُن کی نظر آ گئی جہاں مجھ کو خیال آ گیا جامِ شراب کا

۳۔ تشبیہہ مفرد :- جب ایک واحد چیز کو دوسری واحد چیز سے تشبیہہ دی جائے تو وہ تشبیہہ مفرد کہلاتی ہے مثلاً:- پھول جیسے رخسار

۴۔ تشبیہہ مرکب :- جب دو چیزوں کو کسی ہیئتِ مجموعی میں اس طرح تشبیہہ دیں کہ اس کے اجزا میں سے کسی ایک جز کو نکال دیں تو تشبیہہ غلط ہو جائے۔ مثلاً :- ؎

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا

کِھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

"چرخِ اخضری" کو چمن سے اور "آفتاب" کو "گلاب" سے تشبیہہ دی ہے۔

۵۔ تشبیہہ قریب :- اس تشبیہہ کو کہتے ہیں جس میں وجہ تشبیہہ آسانی سے معلوم ہو سکے جیسے :- جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں

یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

۲۔ وہ عکس چراغوں کا جھلکتا نظر آتا پانی کا ستارہ بھی چمکتا نظر آتا

۶۔ تشبیہہ بعید:۔ وہ تشبیہہ جس میں وجہ تشبیہہ یا وجہ مشبّہ تھوڑا غور کرنے کے بعد ہی سمجھ میں آئے۔ اس طرح کی تشبیہہ کو شاعری کا حسن قرار دیا جاتا ہے۔ مثلاً:۔

تیرے سرو قامت سے اِک قدِ آدم قیامت کے فتنے کو کم جانتے ہیں۔

محبوب کے "سرو قامت" کو "قیامت کے فتنے" سے تشبیہہ دی گئی ہے جس میں وجہ تشبیہہ "قدو قامت اور اس کی شوخی و طراری" ہے۔

تشبیہہ و استعارہ کا فرق:۔ تشبیہہ میں کسی ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند یا ہم شکل بتایا جاتا ہے جبکہ استعارہ میں ایک چیز کو اس کے اصلی معنی سے ہٹ کر دوسرے معنی میں لیا جاتا ہے۔ دوسرا فرق یہ بھی ہے کہ تشبیہہ میں مشبّہ اور مشبّہ بہ دونوں کا ہونا ضروری ہے جب کہ استعارہ میں ان دونوں میں سے کسی ایک کا ہونا ضروری ہے (تفصیل کیلئے دیکھئے اسی کتاب کا حصّہ اوّل صفحہ ۱۳۷)

مرکب الفاظ اور ان کی قسمیں

دو یا دو سے زائد کلموں کے مجموعے کو "مرکب" کہتے ہیں۔ مثلاً:۔ وسیع میدان، دریا کا پانی وغیرہ۔ مرکب الفاظ کی دو قسمیں ہیں:۔ (i) مرکب تام (ii) مرکب ناقص

مرکب تام:۔ وہ جملہ جس سے پورا مفہوم سمجھ میں آجائے جیسے "یہ میری کتاب ہے"۔ اس کو ہم جملہ بھی کہتے ہیں۔

مرکب ناقص:۔ وہ مرکب الفاظ جس کو سُن کر پوری بات سمجھ میں نہ آئے۔ جیسے سفید گھوڑا، میری کتاب وغیرہ اس طرح کے مرکب کو ہم کلام ناقص بھی کہتے ہیں۔ مرکب ناقص دو طرح کے ہوتے ہیں:۔

(i) مرکب غیر امتزاجی:۔ ایسے مرکب الفاظ جن کے اجزا الگ الگ اور بدستور حالت میں ظاہر ہوں جیسے گل قند (گل + قند) عطر فروش (عطر + فروش)

(ii) مرکب امتزاجی:۔ جملے کے اجزا جب ایک دوسرے سے اس طرح

مل جائیں کہ وہ ایک معلوم ہوں لیکن جب ان کو الگ الگ کیا جائے تو لفظ کی ظاہری صورت بدل جائے جیسے ہندوستان (ہندو + ستان) کمزور (کم + زور) شاہجہاں آباد (شاہ + جہاں + آباد) اُردو زبان میں زیادہ تر چیزوں اور شہروں کے نام "مرکب امتزاجی" ہیں۔

مرکب امتزاجی کی تین قسمیں ہیں :۔

(۱) اسمی :۔ وہ مرکب لفظ جس سے کسی چیز یا جگہ کے نام کا اظہار ہو جیسے "گلستان (گل ستان)"

(۲) عددی :۔ جس مرکب لفظ سے کسی عدد کا علم ہوتا ہو مثلاً چھبیس (چھ + بیس)

(۳) مرکب توصیفی :۔ جس مرکب لفظ سے کسی صفت کا اظہار ہوتا ہو جیسے خوبصورت (خوب + صورت) خوشخط (خوش + خط) وغیرہ

مرکب غیر امتزاجی (مرکب ناقص) کی قسمیں

(۱) مرکب اضافی :۔ (مرکب اضافی کی تعریف اور اس کی قسموں کے متعلق دیکھئے اسی کتاب کا حصہ اوّل صفحہ ۳۱)

(۲) مرکب توصیفی :۔ وہ مرکب لفظ جس میں ایک صفت اور دوسرا موصوف ہو جیسے خوش رنگ، نڈر بچہ، میوۂ شیریں وغیرہ۔

(۳) مرکب تمیز و ممیز :۔ جو لفظ یا الفاظ کسی مفرد اسم یا جملے سے شک کو دور کریں اسکو "تمیز" اور جس لفظ سے وہ شک دور ہو اسے "ممیز" کہتے ہیں جیسے دس سیر چینی بارہویں جماعت وغیرہ۔

(۴) مرکب ظرفی :۔ وہ مرکب جو ظرف اور مظروف سے مل کر بنے جیسے شراب خانہ، کتب خانہ، قلم دان، آتش کدہ وغیرہ۔

(۵) مرکب عطفی :۔ وہ مرکب جو معطوف الیہ اور معطوف سے مل کر بنا ہو یعنی دونوں الفاظ حرف عطف (اور، و) کے ذریعہ جڑے ہوں جیسے: قلم اور دوات، حسین و جمیل وغیرہ۔

(۶) مرکب حال ذوالحال :۔ وہ مرکب لفظ جو فاعل یا مفعول کی کیفیت یا حالت کو ظاہر کرے اسے "حال" اور جس اسم کی حالت کو ظاہر کرے اسے "ذوالحال" کہتے ہیں۔ جیسے ہنستا ہوا بچہ، تیرتی ہوئی مچھلیاں۔

(۷) مرکب تاکید و موکد :- ایسے مفرد یا مرکب الفاظ جس کے ذریعہ عبارت میں زور پیدا ہو "تاکید" کہلاتے ہیں مثلاً تمام، سراسر، کُل وغیرہ الفاظ کی تکرار سے بھی "تاکید" ہوتی ہے جیسے روز روز، عجیب عجیب، ہاں ہاں وغیرہ جس اسم یا فعل کی تاکید ہوتی ہے اسے "موکد" کہتے ہیں مثلاً تمام لڑکے، ہاں ہاں جاؤ۔ ان میں "لڑکے" اور "جاؤ" موکد ہیں۔

(۸) مرکب تابع مہمل :- وہ مرکب لفظ جس میں ایک بامعنی اور دوسرا مہمل ہو جیسے جھوٹ موٹ، روٹی ووٹی

(۹) مرکب تابع موضوع :- جس طرح مہمل الفاظ بامعنی الفاظ کے ساتھ بولے جاتے ہیں اسی طرح اصل لفظ کے بعد کچھ بامعنی الفاظ بھی بول چال میں مستعمل ہیں مثلاً :- چال ڈھال، رونا دھونا، کھیل تماشہ وغیرہ

(۱۰) مرکب اشارہ مشارُ الیہ :- وہ مرکب الفاظ جو اشارہ اور مشارُ الیہ سے مل کر بنتے ہیں۔ جیسے وہ مکان، یہ کتاب وغیرہ ("وہ" اشارہ "مکان" مشارُ الیہ)

(۱۱) مرکب جار مجرور :- وہ مرکب الفاظ جو جار مجرور سے مل کر بنے ہوں جیسے شام تک، دوکان میں، چھت پر وغیرہ (تک، میں، پر حرف جار اور شام، دوکان، چھت مجرور ہیں)

علمِ نحو

اس کتاب کے حصہ اول میں بتایا جا چکا ہے کہ "علم نحو" وہ علم ہے جس کے ذریعہ جملوں کی بناوٹ اور ان کے الفاظ کی باہمی ترتیب و تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ علمِ نحو کے باب میں ہم دو باتوں کا مطالعہ کرتے ہیں :-

(۱) جملے کے اجزا :- اس کو نحو تفصیلی بھی کہتے ہیں۔ جملہ میں زمانہ، تعداد، جنس اور حالت وغیرہ کے لحاظ سے تبدیلی آتی رہتی ہے اس کے دوسرے حصے میں جملوں کی بناوٹ سے بحث کی جاتی ہے اس کو "نحو ترکیبی" کہتے ہیں۔ ذیل میں جملے کے اسی دوسرے حصے کے متعلق مختصراً بیان کیا جائے گا۔

جملے کی تعریف :- الفاظ کا وہ مجموعہ جس کو سننے کے بعد اس کا پورا مفہوم سمجھ میں آجائے

اور اس کی وضاحت کے لئے مزید انتظار نہ کرنا پڑے۔ مثلاً تم جاؤ، آم میٹھا ہے وغیرہ (مثالوں سے یہ ثابت ہوا کہ جملہ میں کم از کم دو کلموں کا ہونا ضروری ہے۔)

مرکب جملوں میں جب سب ہی مفرد جملے برابر کی حیثیت رکھتے ہوں اور معنی و مفہوم کے اعتبار سے ایک دوسرے کے محتاج نہ ہوں تو ایسے جملوں کو "مطلق جملے" کہتے ہیں۔ جیسے ۔ہم کھیل رہے تھے اور بچے تماشہ دیکھ رہے تھے۔

کچھ مرکب جملے ایسے ہوتے ہیں جن میں ایک جملہ تو اصل ہوتا ہے باقی جملے اس کے تابع ہوتے ہیں۔ تابع جملوں کے مفہوم اسی وقت واضح ہوتے ہیں جب انھیں اصل جملہ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے۔ ایسے مرکب جملوں کو "ملتف" کہتے ہیں مثلاً "وہ کتاب جو آپ نے منگوائی تھی میں لایا ہوں" اس میں "وہ کتاب میں لایا ہوں۔ اصل جملہ ہے اس کا تابع جملہ ہے۔ "جو آپ نے منگوائی تھی"۔ بناوٹ کے لحاظ سے جملے دو طرح کے ہوتے ہیں:۔

(۱) مفرد جملے:۔ ایسے جملے جس میں صرف ایک فعل ہو جیسے "نفیس نے کھانا کھایا۔ طلعت آئی۔

(۲) مرکب جملے:۔ دو یا دو سے زائد جملے مل کر جب کسی ایک مفہوم کو ادا کرتے ہیں تو وہ مرکب جملے کہلاتے ہیں۔ اس میں سے ایک سے زیادہ فعل بھی آتے ہیں۔ جیسے "تم پڑھو گے تو پاس ہو جاؤ گے"، "مجھے اطلاع ہوتی تو میں ضرور آتا"۔ جملہ کے حسب ذیل دو بڑے اجزا ہیں۔

(۱) مسند الیہ (۲) مسند

مسند الیہ :۔ جملہ میں جس شخص یا چیز کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے اس کو "مسند الیہ" کہتے ہیں۔

مسند :۔ جملہ میں جو کچھ کسی شخص یا چیز کے متعلق کہا جاتا ہے۔ اسے "مسند" کہتے ہیں۔ جیسے احمد نیک ہے، آم میٹھا تھا۔ مذکورہ بالا مثالوں میں "احمد" اور "آم" "مسند الیہ ہیں ۔ "نیک ہے"۔ "میٹھا تھا" مسند ہیں"۔ جملوں میں مسند اور مسند الیہ دونوں ہی اسم ہو سکتے ہیں۔ جب کہ فعل ہمیشہ "مسند" ہی ہوتا ہے۔

مبتدا اور خبر :۔ جملہ کا کام کسی بات کے متعلق خبر دینا ہے۔ چنانچہ جملہ کا وہ جز جس کے متعلق ہمیں کوئی خبر ملتی ہے اس کو "مبتدا" اور مبتدا کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کو "خبر" کہتے ہیں۔ یہ یاد رکھئے کہ مبتدا ہمیشہ جملہ کے شروع میں ہوتا ہے

جو عموماً اسم یا ضمیر ہوتا ہے۔ اسی طرح "خبر" کا بھی "مبتدا" سے متعلق ہونا ضروری ہے۔ جیسے رامو چور ہے۔ اس جملہ میں "رامو" مبتدا اور "چور ہے" خبر ہے۔

معنی کے لحاظ سے جملوں کی دو قسمیں ہیں :۔

(۱) جملہ انشائیہ :۔ وہ جملہ جس میں کوئی خبر یا اطلاع نہ ہو بلکہ کسی طرح کا حکم، مخالفت، تعجب، انبساط، سوال یا حروف فنجائیہ میں سے کوئی ایک پایا جائے مثلاً :۔ کتاب کھولو! کاش تم آتے، وہاں کون ہے؟ وغیرہ

(۲) جملہ خبریہ :۔ وہ جملہ جس میں متکلم کے ذریعہ کسی خبر کی اطلاع ہو جیسے۔ عامر خوب صورت ہے۔ (ا) میں نے امرود خریدا۔ ان دونوں مثالوں میں خبر پائی جاتی ہے۔ جملہ خبریہ کی حسب ذیل دو قسمیں ہیں :۔

(۱) جملہ اسمیہ خبریہ :۔ جملے کے دونوں اجزا یعنی مسند الیہ اور مسند میں سے ہر ایک اسم ہو اور اس جملہ میں کسی کام کا ہونا یا کرنا نہ پایا جائے تو ایسے جملے کو "جملہ اسمیہ خبریہ" کہتے ہیں۔ "جملہ اسمیہ" مبتدا، خبر اور فعل ناقص سے بنتا ہے جیسے انور ذہین ہے۔

مبتدا خبر فعل ناقص

(۲) جملہ فعلیہ خبریہ :۔ وہ جملہ جس سے کسی کام کا ہونا یا کرنا ظاہر ہو اور اس جملہ میں فاعل بھی ہو تو ایسے جملہ کو "جملہ فعلیہ خبریہ" کہتے ہیں جیسے :۔ انور نے کیلے کھائے۔

فاعل علامت فاعل مفعول فعل

نوٹ :۔ (ا) ترکیب نحو میں اگر جملہ اسمیہ ہو تو مسند الیہ کو مبتدا اور مسند کو "خبر" کہتے ہیں۔ اگر جملہ فعلیہ ہو تو مسند الیہ کو "فاعل" اور مسند کو "فعل" کہتے ہیں۔

(۲) جملہ اسمیہ کے ساتھ "فعل ناقص" آتا ہے اور "جملہ فعلیہ" فاعل فعل (مفعول بھی ہو سکتا) سے مل کر بنتا ہے (جملوں کے اجزا یعنی فاعل، مفعول فعل لازم اور فعل متعدی وغیرہ کی پہچان کے طریقے معلوم کرنے کے لئے دیکھئے اسی کتاب کا حصہ اول صفحہ ۲۱)

طور معروف اور طور مجہول

معنی کے لحاظ سے فعل کی تین قسمیں ہیں :۔

(۱) فعل لازم (۲) فعل متعدی (۳) فعل ناقص (ان تینوں کے بارے میں اسی کتاب کے حصہ اوّل میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔)

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ فعل کی تذکیر و تانیث اور اس کا صیغہ واحد یا جمع میں ہونا فاعل کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ فعل کے استعمال کا انحصار حسب ذیل دو باتوں پر بھی ہے اوّل طور (VOICE) دوم زمانہ (TENSE)۔

"طور" سے فعل کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے یعنی فعل واضح طور پر فاعل کے ذریعہ ہوا ہے۔ یا اس کا فاعل پوشیدہ ہے۔ فاعل کے ظاہر ہونے کی صورت میں اس جملہ کا فعل "فعل معروف" اور جملہ "طور معروف" (ACTIVE VOICE) کہلاتا ہے۔ جیسے :۔ "انور نے کتاب پڑھی"، "استاد نے بچوں کو مارا۔"

طور مجہول :۔ وہ جملہ جس میں کام کا کرنے والا (فاعل) ظاہر نہ ہو "طور مجہول" (PASSIVE VOICE) کہلاتا ہے اور اس کے فعل کو "فعل مجہول" کہتے ہیں۔ جیسے "کتاب پڑھی گئی"، "بچوں کو مارا گیا"، "کل نتیجہ کا اعلان ہوگا"۔ طور مجہول میں فاعل کا تو پتہ نہیں چلتا ہاں مفعول واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے اور عموماً اسی سے جملہ شروع ہوتا ہے۔ جیسے کھڑکیاں کھل گئیں۔ کھلونے ٹوٹ گئے وغیرہ۔

"طور مجہول" کے جملہ کا فعل، فعل متعدی ہوتا ہے۔ جس فعل کو فعل مجہول میں تبدیل کرنا ہو اس فعل کے ماضی مطلق کے آگے مصدر "جانا" سے جو زمانہ بنانا مقصود ہو وہ لگا دیا جاتا ہے۔ مثلاً "لکھنا" مصدر سے طور مجہول (زمانہ حال) بنانا ہے تو "لکھنا" کا ماضی مطلق ہوا "لکھا" اس کے آگے مصدر "جانا" کا حال مطلق "جاتا" بڑھا دیا جائے تو ہوا "لکھا جاتا ہے"، اسی کا ماضی مطلق ہوا "لکھا گیا"، اور فعل مستقبل بنا "لکھا جائے گا"۔

بہت سے فعل بذاتِ خود "فعل مجہول" ہیں جیسے لُٹنا ۔ پٹنا وغیرہ (قافلہ لٹ گیا۔ بچے پٹ گئے۔) ان جملوں میں قافلہ اور بچے فاعل نہیں بلکہ مفعول ہیں ان کے فاعل نامعلوم ہیں۔ اس طرح کے جملوں کو "طورِ مجہول" کہتے ہیں۔ ذیل میں "طورِ مجہول" کے جملوں کی چند مثالیں دی گئی ہیں :۔ وہاں مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں (فعل حال) وہاں مچھلیاں پکڑی گئیں (ماضی مطلق) وہاں مچھلیاں پکڑی جائیں گی۔ (فعل مستقبل)

ترکیب نحوی اور اس کے چند اصول

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ جملوں میں الفاظ کے آپسی تعلقات اور ان کے اظہار کا نام "ترکیب نحوی" ہے۔

(۱) کسی شعر یا مصرعہ کی ترکیب نحوی کرنے سے پہلے اس کی نثر کر لینی چاہیئے۔

(۲) جملہ کو پڑھنے کے بعد اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ یہ جملہ اسمیہ ہے یا جملہ فعلیہ پھر اسی کے مطابق اس کے اجزا تلاش کرنے چاہیئں۔

(۳) جملہ کی ترکیب نحوی میں سب سے پہلے فاعل یا اسم اس کے بعد مفعول یا اسم پھر متعلقات فعل وغیرہ کی وضاحت کرتے ہیں۔

(۴) وہ جملہ جس کا فعل "فعل ناقص" ہو اس کے مسند الیہ کو "اسم" اور مسند کو "خبر" لکھتے ہیں۔

(۵) افعال تام یعنی فعل لازم اور فعل متعدی کے مسند الیہ کو "فاعل" اور مسند کو "مفعول" لکھتے ہیں یاد رکھیئے کہ جس جملہ میں یہ تین اجزا (۱) اسم (۲) خبر (۳) فعل ناقص ہوں وہ مجموعی طور پر "جملہ اسمیہ" لکھا جائے گا۔

ترکیب نحوی کے چند نمونے :۔

۱۔ رامو چور ہے :۔

ہے ۔۔۔۔ فعل ناقص
رامو ۔۔۔۔ مبتدا
چور ۔۔۔۔ خبر

(جملہ اسمیہ)

۲۔ انور نے کیلے کھائے

کھائے ۔۔۔۔ فعل متعدی
انور ۔۔۔۔ فاعل
نے ۔۔۔۔ علامت فاعل
کیلے ۔۔۔۔ مفعول

(جملہ فعلیہ)

۳۔ کاش عمران پڑھتا
کاش .... حرف تمنا
عمران .... فاعل
پڑھتا .... فعل

جملہ انشائیہ

۴۔ تمہارا دوست ابھی تک نہیں آیا
دوست ... مبتدا
تمہارا ... توسیع مبتدا
نہیں آیا ... خبر
ابھی تک ... توسیع خبر

جملہ خبریہ

علمِ عروض

اسی کتاب کے حصہ اوّل میں علم عروض کی تعریف میں بتایا جا چکا ہے کہ "علم عروض" وہ علم ہے جس کے ذریعہ اشعار کے وزن کو جانچتے ہیں یعنی شعر کے موزوں یا ناموزوں ہونے کا علم ہمیں علم عروض کے ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ "علم عروض" کے موجد کا نام خلیل بن احمد ہے جو بصرہ کا رہنے والا تھا۔ اس کی وفات ۱۷۰ھ میں ہوئی۔ اس نے پندرہ اوزان مقرر کئے اور ان کا نام "بحر" رکھا۔ ان کے علاوہ چار بحریں دوسروں نے رائج کیں اس طرح کل ۱۹ بحریں ہیں۔ علم عروض کی اصطلاح میں شعر کو ارکان بحر کے مطابق تولنے یا جانچنے کو "وزن" کہتے ہیں۔ اس کی جمع "اوزان" ہے شعر کے الفاظ کو ارکان بحر کے مطابق مختلف ٹکڑوں میں بانٹنے کو "تقطیع" کہتے ہیں تقطیع کے معنی ہیں قطع کرنا یا ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ تقطیع ہی علم عروض کا اصلی فن ہے۔ اس ضمن میں چند اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے۔

زیر زبر پیش کو "حرکت" یا "اعراب" کہتے ہیں۔ جن حروف پر حرکت ہوتی ہے اسے "متحرک" کہتے ہیں۔ جن حروف پر کوئی حرکت نہیں ہوتی اسے "ساکن" کہتے ہیں۔ سکون کی علامت کو "جزم" کہتے ہیں جو ساکن حروف پر ہوتی ہے۔

ارکان :۔ بحر کا تعین جن اجزا سے ہوتا ہے ان کو ارکان اور اس کے ہر حصّے کو رکن کہتے ہیں۔ ارکان کو افاعیل، امثال یا اوزان بھی کہتے ہیں۔ ارکان کے ٹکڑوں کو اجزا یا اصول کہتے ہیں۔ یہ ارکان مندرجہ ذیل تین اصولوں سے مرتب ہوتے ہیں:۔

(i) سبب (ii) وتد (iii) فاصلہ

۱۔ سبب :۔ دو حرفوں سے مل کر بننے والے الفاظ کو "سبب" کہتے ہیں جیسے دن شب۔ ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ (i) سببِ خفیف (ii) سببِ ثقیل۔

سبب خفیف :۔ ایسے دو حرفی الفاظ کو کہتے ہیں جس کا پہلا حرف متحرک اور دوسرا ساکن ہو جیسے دِق، جیب وغیرہ۔

سبب ثقیل :۔ ایسے دو حرفی الفاظ جس کے دونوں حروف متحرک ہوں جیسے دل۔ لب (دلِ ناداں، لبِ دریا) اردو میں سبب ثقیل صرف اضافت کی صورت میں آتے ہیں ورنہ نہیں۔

۲۔ وتد :۔ تین حرفی الفاظ کو "وتد" کہتے ہیں جیسے وطن۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں:۔

(i) وتد مجموع (ii) وتد مفروق

وتد مجموع :۔ ایسے الفاظ جن کا پہلا اور دوسرا حرف متحرک اور تیسرا ساکن ہو جیسے شجر، جگر، وطن

وتد مفروق :۔ ایسے سہ حرفی الفاظ جن کا پہلا اور تیسرا حرف متحرک اور درمیانی نقطہ ساکن ہو جیسے شانِ، داغِ (شانِ نزول، داغِ جگر) اردو میں وتد مفروق صرف اضافت لگنے کی صورت میں ہوتے ہیں ورنہ نہیں جیسا کہ مثالوں سے ظاہر ہے۔

۳۔ فاصلہ :۔ چار اور پانچ حروف والے الفاظ کو علم عروض کی اصطلاح میں "فاصلہ" کہتے ہیں۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں فاصلہ صغریٰ اور فاصلہ کبریٰ۔

ارکان ہفت گانہ

"سبب" اور "وتد" کے اصولوں پر سات ارکان بنتے ہیں انھیں "ارکان ہفت گانہ" یا "افاعیل ہفت گانہ" کہتے ہیں۔ ان میں شروع کے دو ارکان پانچ حرفی اور بقیہ پانچ ارکان سات حرفی ہوتے ہیں۔

بحر اور اس کی قسمیں :۔ شعر کا وزن یعنی اس کے موزوں یا ناموزوں ہونے کی واقفیت کے لئے کچھ ارکان مقرر کئے گئے ہیں ان ارکان کی تکرار سے جو خاص وزن پیدا ہوتا ہے اسے "بحر" کہتے ہیں۔ بحر کا تعین دونوں مصرعوں کے ارکان کی مجموعی تعداد کی مناسبت سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً شعر کے دونوں مصرعوں میں کل ملا کر آٹھ ارکان ہوں تو وہ بحر "بحر مثمن" اور اگر چھ ارکان

ہوں تو "بحر مسدس" کہلائے گی۔ بحریں دو طرح کی ہوتی ہیں :۔

۱۔ مفرد بحر :۔ مفرد بحر ایک ہی رکن کو بار بار لانے سے بنتی ہے پہلے اور دوسرے مصرعے میں چار چار بار آتے ہیں اس طرح کل آٹھ رکن ہوتے ہیں۔

۲۔ سالم مفرد بحر :۔ جس کے ارکان اپنی اصلی حالت میں ہوں ان میں زحاف کی وجہ سے کوئی تبدیلی نہ آئی ہو۔ یہ سات ہیں۔ اردو شاعری میں سالم بحریں بہت کم مروج ہیں۔

زحاف :۔ علم عروض کی اصطلاح میں "زحاف" اُس تبدیلی کو کہتے ہیں جو شعر کے رکن یا ارکان میں کی گئی ہو اُسے "مزاحف" (زحاف والی) بھی کہتے ہیں۔ زحاف کی تین صورتیں ہوتی ہیں :۔

(۱) اضافہ (۲) کمی (۳) ساکن

"اضافہ" میں کسی حرف کو بڑھا دیتے ہیں "کمی" میں ایک یا ایک سے زیادہ حرفوں کو گرا دیتے ہیں۔ تیسری صورت میں ساکن حروف کو متحرک کرنا ہوتا ہے۔

اردو کے کچھ خاص الفاظ اور ان کا مناسب استعمال

(۱)۔ اسم واحد کے ساتھ "ہر" اور جمع کے ساتھ "تمام" کا استعمال ہوتا ہے جیسے۔ ہر لڑکا، تمام لڑکے۔

(۲) "ہر دن" کے بجائے "ہر روز"۔ "آئے روز" کے بجائے "آئے دن" اور "زندہ درگور" کے بجائے "زندہ درگور" صحیح ہے۔

(۳)۔ کاش، گویا، اور غرض، کے آخر میں "کہ" کا استعمال غلط ہے۔ مثلاً "کاش کہ میں وہاں ہوتا"

(۴)۔ "بمعہ" غلط ہے اس کی جگہ "معہ" کا استعمال درست ہے مثلاً: "معہ اہل و عیال تشریف لائیں"

(۵)۔ "مرحوم" کے ساتھ "صاحب" لکھنا یا بولنا غلط ہے۔ فعل مؤنث جمع میں فعل کی گردان کے ساتھ "ن" کا استعمال زائد ہے جو غلط سمجھا جاتا ہے۔ جیسے "لڑکیاں آئیں ہیں"۔ (آئی ہیں)

(۶)۔ "ہم" کے ساتھ فعل مذکر کا استعمال ہوتا ہے خواہ اس جمع متکلم یعنی "ہم" کا استعمال کرنیوالا مرد ہو یا عورت جیسے لڑکیوں نے کہا۔ "ہم شفیق میموریل اسکول میں پڑھتے ہیں"۔

(۷) "و" کے ذریعہ وہی الفاظ جوڑے جاتے ہیں جو فارسی زبان کے ہوں جب کہ "اور"

کے ذریعہ اردو یا ہندی کے الفاظ جوڑے جاتے ہیں مثلاً "نشیب و فراز"۔ "کاپی اور کتاب"

(۸)۔ اگر مرتبہ میں فاعل بڑا یا قابلِ تعظیم ہے تو واحد ہوتے ہوئے بھی اس کے لئے "فعل جمع کے صیغہ میں استعمال ہوتا ہے جیسے۔ پرنسپل صاحب تقریر کریں گے۔

(۹)۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ جملہ میں فاعل پہلے اور مفعول بعد میں آتا ہے۔ جیسے۔ استاد نے بچوں کو پڑھایا۔"

"فاعل" کے بعد "نے" کی علامت "علامتِ فاعلی" کہلاتی ہے اس جملہ میں مفعول تو ہوتا ہی ہے اس کا فعل بھی فعل متعدی ہوتا ہے جیسے "احمد نے کتاب پڑھی"۔ اس میں "احمد فاعل ہے۔"

(۱۰) جملے میں اگر دو فاعل ہوں تو اس جملہ کا فعل آخر کے فاعل کے مطابق مذکر یا مؤنث ہوگا جیسے ہمارے اسکول میں لڑکے اور لڑکیاں پڑھتی ہیں۔

(۱۱)۔ "کو" مفعول کی علامت ہے۔ عموماً اس سے پہلے کا اسم مفعول ہوتا ہے۔ جیسے "پولیس نے چوروں کو پکڑا۔ (چوروں مفعول ہے) اگر مفعول غیر ذی روح یا غیر ذی عقل ہو تو عموماً اس کے بعد "کو" کی علامت نہیں آتی جیسے میں نے کتاب پڑھی۔ نبیل نے مچھلیاں پکڑیں۔

(۱۲)۔ عربی، فارسی کے الفاظ جو جمع کے صیغہ میں ہوں ان کی ہندی قاعدے کے مطابق جمع بنانا غلط ہے مثلاً احبابوں، الفاظوں، ارواحوں وغیرہ

(۱۳)۔ اکثر لوگوں کو کہتے ہوئے سنا جاتا ہے کہ "میں آپ کا مشکور ہوں" اس طرح لکھنا یا کہنا غلط ہے کیونکہ "مشکور" اسم مفعول ہے اسم فاعل نہیں۔ یعنی آپ جس کا شکریہ ادا کر رہے ہیں وہ مشکور ہے۔ آپ تو شاکر ہیں۔ اس لئے آپ کو کہنا چاہیئے "میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ یا ممنون ہوں۔"

(۱۴) "دراصل میں" غلط ہے۔ "در" کے ساتھ "میں" نہیں آتا۔ "دراصل" یا "اصل میں" درست ہے۔

(۱۵) "دہی" مذکر ہے لوگ عموماً غلطی سے اس کا استعمال مؤنث کے صیغہ میں کرتے ہیں۔ "دہی کھٹا ہے" کہنا صحیح ہے۔

(۱۶)۔ آدابِ گفتگو میں یہ شامل ہے کہ "فرمانا" "تشریف لانا" "دولت خانہ" "اسم شریف" "مزاج اقدس" وغیرہ اپنے لئے نہیں استعمال کئے جاتے۔ کیونکہ یہ الفاظ اپنے مخاطب کے لئے تعظیماً یا اس کے مرتبہ کو بڑھانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اپنے لئے ان الفاظ کی جگہ پر بطور انکساری و عاجزی "میں نے عرض کیا" "حاضر ہوں گا" "میرا غریب خانہ" "ناچیز خادم وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال اچھا سمجھا جاتا ہے۔

حروف ابجد

الفاظ کے ذریعہ اعداد ظاہر کرنے کا یہ طریقہ عربی زبان سے شروع ہوا تھا جو اردو میں بھی رائج ہو گیا۔ گنتی کے اس طریقہ کو "قاعدہ ابجد" یا "طریقہ جُمّل" کہتے ہیں۔ اس طریقہ میں عربی حروف تہجی کی قیمت ہندسوں میں مقرر کر دی گئی ہے۔ حرفوں کی اس ترتیب کو ابجد، ہوز، حطّی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ ان الفاظ کے حروف تہجی اور ان کے مقرر کردہ ہندسے حسب ذیل ہیں :-

ا	ب	ج	د	ہ	و	ز	ح	ط	ی	ک	ل	م	ن
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰

س	ع	ف	ص	ق	ر	ش	ت	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰	۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

مذکورہ بالا حروف کے ذریعہ ایسے الفاظ یا مصرع بنائے جاتے ہیں جن کے اعداد کو اگر جمع کیا جائے تو وہ مطلوبہ شخص کی پیدائش کا سال یا سنِ وفات ہوتا ہے۔ اسے "تاریخ نکالنا" کہتے ہیں اس طریقہ میں مُشدّد حروف کو ایک ہی بار شمار کیا جاتا ہے۔ چونکہ پ۔ ٹ۔ چ۔ ڈ۔ ڑ۔ ژ۔ گ عربی میں نہیں ہیں اس لیے ان حروف کی گنتیاں ان کے قریب ترین عربی حروف کے اعتبار سے مقرر کر دی گئیں جو حسب ذیل ہیں :-

پ	ٹ	چ	ڑ	ژ	گ
۲	۴۰۰	۳	۲۰۰	۷	۲۰

ہمزہ کو گنتی میں شمار نہیں کیا جاتا۔ علامہ اقبالؔ کی تاریخِ وفات "شمعِ شاعری خاموش" ۱۹۳۸ء سے نکلتی ہے جیسے :- (۱)

ش	م	ع	ش	ا	ع	ر	ی	خ	ا	م	و	ش
۳۰۰	۴۰	۷۰	۳۰۰	۱	۷۰	۲۰۰	۱۰	۶۰۰	۱	۴۰	۶	۳۰۰

= ۱۹۳۸ء

(۲) چکبستؔ کے ہی ایک مصرعہ سے ان کی تاریخِ وفات نکلتی ہے۔ ع

"موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں ہونا" ۱۳۴۴ھ

(۳) ناسخؔ نے میرؔ کی وفات پر حسب ذیل تاریخ کہی ہے :- "واویلا مُرد شہہ شاعراں" ۱۲۳۰ھ

تلمیحات

تلمیح کی تعریف اور اردو ادب میں ان کی اہمیت کے متعلق پہلے بتایا جاچکا ہے۔ یہاں اردو زبان کی اُن مشہور تلمیحات اور ان کے پس منظر کو بیان کیا گیا ہے جن کا ذکر اردو ادب میں جگہ جگہ ملتا ہے ان میں سے بیشتر مذہبی تلمیحات ہیں جن کی صداقت کا ثبوت ہمیں قرآن پاک اور دوسری کتابوں سے بھی ملتا ہے۔

۱۔ ابنِ مریم (حضرت عیسیٰ علیہ السلام)

"ابن مریم" یعنی حضرت مریم کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک پیغمبر تھے۔ آپ پر "انجیل" جو مقدس کتاب ہے خدا کی طرف سے نازل ہوئی۔ ان کو عیسائی خدا کا بیٹا مانتے ہیں کیونکہ خدا کی قدرت سے بغیر باپ کے آپ بی بی مریم کے بطن سے پیدا ہوئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بچپن سے ہی بہت نیک اور خدا ترس انسان تھے بڑے ہو کر آپ نے لوگوں کو حق کا پیغام سنانا شروع کیا۔ یہودی لوگ ان کے بہت مخالف تھے۔ طرح طرح سے آپ کو حق بات کہنے سے روکتے اور اذیتیں پہنچاتے۔ خداوند تعالیٰ نے آپ کو دو معجزات عطا فرمائے تھے۔ اوّل یہ کہ آپ کوڑھی، لنگڑے یا کسی طرح کے مریض پر پھونک مار دیتے تو اس کو حکم خداوندی سے شفا ہو جاتی اور وہ تندرست ہو جاتا۔ اس کے علاوہ آپ خدا کے حکم سے مردے کو زندہ بھی کر دیتے تھے اسی لئے حضرت عیسیٰ کو "مسیحا" کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں کے خیال کے مطابق ان کی تعلیمات کی مخالفت کرنے والے بادشاہ نے ان کو صلیب پر چڑھا دیا جب کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ انھیں خداوند تعالیٰ نے آسمان پر زندہ اٹھا لیا اور ان کی جگہ دوسرا آدمی عیسیٰ علیہ السلام کے

دھوکے میں صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب "روح اللہ" بھی ہے۔

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی (غالبؔ)

تیرے کُشتوں سے جو صورت آشنا ہو جائے گا
زندگی سے دم مسیحا کا خفا ہو جائے گا (آتشؔ)

۲۔ سجدۂ آدم

جب خداوند تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے جسم میں روح پھونکی اور وہ ظہور میں آئے تو تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ چنانچہ تمام فرشتے حکم خداوندی کو بجا لائے مگر فرشتوں کے سردار عزازیل (ابلیس) نے سجدہ نہیں کیا اور تکبر سے بولا میں تمام فرشتوں کا سردار ہوں اور آگ سے پیدا کیا گیا ہوں مٹی کے بنے ہوئے آدم کو سجدہ کرنا میری توہین ہے۔ خدا کو اُس کی یہ گستاخی اور نافرمانی پسند نہیں آئی چنانچہ وہ راندۂ درگاہ قرار پایا اور اس کے گلے میں لعنت کا طوق ڈال کر قیامت تک کے لئے زمین پر بھیج دیا۔ دنیا میں یہ ابلس یا شیطان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ چونکہ ابلیس خود جہنمی ہے اس لئے قیامت تک خدا کے نیک بندوں کو طرح طرح سے بہکا کر جہنمی بنانے کی کوشش کرتا رہے گا۔

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے پر
ہزاروں سال سجدے میں جو سر مارا تو کیا مارا

۳۔ آدم و حوّا

شجر فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

حضرت آدم علیہ السلام دنیا کے سب سے پہلے انسان تھے۔ انھیں سے نسلِ

انسانی کا آغاز ہوتا ہے ۔ آپ پیغمبر بھی تھے ۔ ان کی بیوی کا نام حضرت حوّا علیہا السلام تھا۔ دنیا میں آنے سے پہلے بحکم خداوندی یہ دونوں بہشت میں رہتے تھے مگر اللہ نے سختی سے منع فرما دیا تھا کہ بہشت کی ہر نعمت تمہارے لئے ہے ان کو استعمال کرو مگر اس درخت کا پھل مت کھانا ورنہ معتوبین میں تمہارا شمار ہوگا۔ چونکہ شیطان کا کام ہی دھوکا دینا اور برائی کی طرف لے جانا ہے اس لئے ایک روز دھوکا دیکر حضرت آدم علیہ السلام اور حوّا دونوں کو اس شجرِ ممنوعہ کا پھل کھلا دیا۔ اللہ کو ان کی یہ نافرمانی پسند نہیں آئی اور انھیں جنت سے نکال کر دنیا میں بھیج دیا۔ میاں بیوی دونوں ایک دوسرے سے تقریباً تین سو سال تک جدا رہے ۔ اپنی غلطی پر دونوں نادم تھے اور برسوں رات و دن رو رو کر اللہ سے معافی چاہتے رہے ۔ وہ بڑا رحیم ہے اُس نے ان کے گناہ معاف کردیئے اور پھر میاں بیوی دونوں ایک جگہ آکر حکم خداوندی سے مل گئے ۔ اللہ کے حکم کی نافرمانی کرنے پر اُنھیں جس قدر سزا ملی تھی اس سے کہیں زیادہ معافی مانگنے کے بعد ان پر رحمتیں نازل ہوئیں ۔ سارے انسان بابا آدم اور ماں حوّا کی ہی اولاد ہیں ۔

ع نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے (غالب)

ع توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریٔ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک (اقبال)

۴۔ آبِ حیات

آبِ حیات کو "چشمۂ حیواں" بھی کہتے ہیں۔ دنیا کے کسی نامعلوم علاقہ میں یہ پانی کا وہ چشمہ ہے جس کو پی لینے کے بعد انسان قیامت تک زندہ رہ سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سکندرِ اعظم کو اس چشمہ تک رسائی ہوگئی تھی جب اس نے اس چشمہ کے اطراف میں مختلف جانداروں کو سسکتے اور ایڑیاں رگڑتے موت کا منتظر دیکھا تو اس نے "آبِ حیات" پینے کا ارادہ ترک کردیا اور بغیر پانی پئے واپس آگیا۔

؎ گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو (اقبال)

؎ ہے آبِ حیات اسی جہاں میں شرط اس کے لئے ہے تشنہ کامی (اقبال)

۵۔ جامِ جمؔ

اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا
نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جمؔ کو (اقبال)

"جامِ جمؔ" کو جامِ جمشید بھی کہتے ہیں اس پیالہ کو کیخسرو نے بنایا تھا جس پر علمِ رمل (ستاروں کا علم) کے حساب سے خطوط اور ہندسے کھینچے ہوئے تھے اس کے ذریعہ جمشید بادشاہ کو پیش آنے والے حادثات اور واقعات کا علم پہلے سے ہو جاتا تھا۔ اردو ادب میں "جامِ جم" یا جامِ جمشید کو شاہانہ شوکت اور عظمت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

؎ اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے (غالب)

؎ جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں (اقبال)

۶۔ جنّتِ شدّاد یا باغِ اِرم

شدّاد قومِ عاد کے ایک کافر و مغرور بادشاہ کا نام ہے جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔ اس نے بہشت کے نمونہ پر ایک باغ بنوایا تھا جو "باغِ اِرم" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ باغ تقریباً ۲۵ میل کی وسعت میں پھیلا ہوا تھا اور اپنی خوبصورتی اور دلکشی کے لئے پوری دنیا میں مشہور تھا۔ یہ باغ طرح طرح کے پھل دار درختوں، فوّاروں، نہروں اور عالیشان محلّات سے آراستہ تھا باغ کے تیار ہو جانے پر ایک روز وہ اس باغ کو دیکھنے کے لئے گیا۔ جیسے ہی شدّاد اس کے دروازے پر پہنچا اس کی روح پرواز کر گئی وہ اپنے

لئے تیار کی ہوئی جنت کو دیکھ بھی نہ سکا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ باغ جو جنتِ شدّاد کے نام سے مشہور ہے حضر موت نامی مقام پر بنایا گیا تھا۔

کیا سناؤں تمہیں اِرم کیا ہے　　خاتمِ آرزوئے دیدہ و گوش　(اقبال)

۷۔ حضرت خضر علیہ السلام

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　اب کسے رہنما کرے کوئی　(غالب)

حضرت خضر علیہ السلام ایک پیغمبر ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے ان کے ذمہ بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھانے کا کام سپرد کیا ہے۔ آپ قیامت تک زندہ رہیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی سکندر بادشاہ سے ملاقات ہوئی تھی آج بھی وہ اجنبی بن کر مختلف بھیس میں بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ آپ "سبز پوش" بھی کہلاتے ہیں کیونکہ ہرے لباس میں رہتے ہیں۔

دور منزل ہو اگر راہ میں تھک جائے کوئی
جب مسافر کہیں رستے میں بھٹک جائے کوئی
خضر کا کام کروں راہ نما بن جاؤں　(افسر میرٹھی)

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ، خضر کا سودا بھی چھوڑ دے　(اقبال)

۸۔ چاہِ کنعان، ماہِ کنعاں

کنعاں ایک ملک کا نام تھا جسے اب فلسطین کہتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام بن حضرت اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کا یہی مسکن تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام یہیں پیدا ہوئے۔ یہ بارہ بھائی تھے ان میں حضرت یوسفؑ سب سے ذہین اور خوبصورت تھے۔ کلام پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے حُسن و جمال کی تعریف کی ہے۔ ان کی دیانت اور فرمانبرداری کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام انھیں بہت چاہتے تھے اس لئے باقی سوتیلے بھائیوں کو ان سے حسد ہوا۔ ایک روز باپ سے

جھوٹ بول کر شکار کھیلنے کے بہانے ان کو جنگل کی طرف لے گئے اور حضرت یوسفؑ کو کنعان کے ایک کنویں میں ڈال دیا۔ مکاری کر کے روتے پیٹتے آئے اور کہنے لگے اے باپ! حضرت یوسفؑ کو تو بھیڑیا اٹھالے گیا یہ دیکھئے ان کا کرتہ ہے جو خون سے تر ہے۔

حضرت یوسفؑ کے غم میں روتے روتے باپ کی بینائی جاتی رہی۔ اس کو "گریۂ یعقوب" بھی کہتے ہیں۔ اتفاق سے ایک قافلہ ادھر سے گزرا جب پانی لینے کے لئے کنویں پر ایک شخص گیا تو اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا اور نکالا۔ چونکہ اس زمانہ میں انسان فروخت کئے جاتے تھے اس لئے ان کو مصر کے بازار میں بیچ کر اچھی قیمت حاصل کی۔

وہ کنواں جس میں بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو لے جاکر ڈال دیا تھا "چاہِ کنعاں" کہلاتا ہے۔ ؎ آرہی ہے چاہِ کنعاں سے صدا
دوستیاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام انتہائی حسین وجمیل تھے اس لئے انھیں "ماہِ کنعاں" کہا جاتا ہے:-

سب حسینوں سے ہیں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں (غالب)

۹۔ یوسف علیہ و زلیخا

بازارِ دہر میں تیری منزل کہاں نہ تھی یوسف نہ جس میں ہو کوئی ایسی دوکاں نہ تھی

حضرت یوسف علیہ السلام کو "چاہِ کنعاں" سے نکالنے کے بعد قافلہ والے ان کو لے کر مصر پہنچے۔ چونکہ آپ حسن میں یکتا اور لاثانی تھے۔ اس لئے اچھی قیمت پر عزیزِ مصر کے ہاتھوں بیچ دیا۔ عزیزِ مصر چونکہ لاولد تھا اس لئے ان کو بیٹا بنانا چاہتا تھا۔ اس کی بیوی زلیخا حضرت یوسفؑ کے حسن وجمال کو دیکھ کر فریفتہ ہو گئی۔ زلیخا کی دیوانگی کو دیکھ کر مصر کی عورتوں نے طنز کیا۔ زلیخا نے ان کی اس بات کا جواب دینے کے لئے زنانِ مصر کی ایک مجلس بلائی اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک لیموں اور چھری دے کر کہا کہ جب میں کہوں

تب لیمو کاٹنا۔ زلیخا کے اشارے پر اچانک یوسف علیہ السلام کو لایا گیا ان کے حسن کو دیکھ کر حسینانِ مصر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھیں اور لیموں کاٹنے کے بجائے اپنی اپنی انگلیاں کاٹ لیں۔ زلیخا ہر چند یوسف علیہ السلام کو اپنی محبت کے جال میں پھنسانے کی کوشش کرتی رہی لیکن جب ناکام ہو گئی تو انتقام لینے کے لئے الٹے یوسفؑ پر بدنیتی کا الزام لگایا اور قید خانہ میں بھجوا دیا۔ لیکن بادشاہ کی تحقیق کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام بے گناہ ثابت ہوئے اور انھیں قید سے رہائی مل گئی۔ ادھر ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے یوسف کی یاد میں روتے روتے نابینا ہو گئے۔

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
(غالب)

۱۰۔ سحرِ سامری

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

سامری مصر کا ایک بہت مشہور جادوگر تھا۔ مصر کا بادشاہ جو فرعون کہلاتا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سخت مخالف تھا کیونکہ حضرت موسیٰؑ خدا کے ایک ہونے اور اسی کے آگے سر جھکانے کی تعلیم دیتے تھے۔ فرعون نے ملک کے مشہور جادوگروں کو بلایا ان میں ایک سامری بھی تھا فرعون نے سامری سے کہا کہ موسیٰ تو مجھے بہت بڑا جادوگر معلوم ہوتا ہے اگر وہ اللہ کا نبی ہے تو یقیناً تمہارے چھوڑے ہوئے سانپوں اور اژدہوں سے بچ جائے گا ورنہ تمہارے اژدہے اس کو نگل جائیں گے۔ چنانچہ سامری نے سیکڑوں اژدہے اپنے جادو کے زور سے ان کو نگلنے کے لئے چھوڑے۔ اُس وقت اللہ کا حکم ہوا کہ اے موسیٰ تم اپنے عصا کو زمین پر ڈال دو، وہ اژدہا بن کر تمام اژدہوں کو جو جادو کے ذریعہ چھوڑے گئے ہیں نگل جائے گا یا مار بھگائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بہت سے کافر اس معجزہ کو دیکھ کر ایمان لے آئے مگر فرعون پھر بھی خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان نہیں لایا۔

۵ نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
ہیں ہلاک جادوئے سامری، تو قتیل شیوۂ آذری (اقبال)

۱۱۔ عصائے موسیٰؑ اور یدِ بیضا

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد (اقبال)

اللہ نے ہر نبی کو کوئی نہ کوئی معجزہ عطا کیا ہے کیونکہ ان کی قوم یا امت کے لوگ بار بار ان سے اس بات کی مانگ کرتے تھے کہ اگر تم اللہ کے نبی ہو تو کوئی ایسا کمال دکھاؤ جو ہم میں سے کوئی دوسرا نہ کر سکتا ہو۔ نبیوں کی دعا پر خدا نے انھیں معجزات عطا فرمائے تاکہ وہ اپنے نبی ہونے کا ان کو یقین دلا سکیں۔ اسی کمال یا انوکھی بات کو "معجزہ" کہتے ہیں جو صرف نبیوں کو عطا ہوتا تھا۔ "عصائے موسیٰ" اور "یدِ بیضا" دو معجزات حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کی طرف سے عطا ہوئے تھے۔ عصائے موسیٰ کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ جب فرعون کے لشکر نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دینے کا ارادہ کیا تو اللہ کا حکم ہوا کہ اے موسیٰ اپنے ان ساتھیوں کو جو اللہ پر ایمان لائے ہیں لیکر شہر سے باہر دور دراز کے علاقہ میں چلے جاؤ۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ چلے تو فرعون کے لشکر نے پیچھا کیا۔ راستہ میں دریائے نیل تھا حضرت موسیٰ کو فکر ہوئی کہ کیونکر دریا پار کریں۔ اس وقت غیب سے خدا کی مدد ہوئی اور حکم ہوا کہ اے موسیٰ تم اپنے عصا کو پانی پر مارو۔ انھوں نے حکم کی تعمیل کی۔ فوراً دریا کا پانی پھٹ گیا اور راستہ نمودار ہوا اس پر چل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی دریا پار کر گئے۔ فرعون کے لشکر نے بھی اسی راستہ پر چل کر حضرت موسیٰ کا تعاقب کرنا چاہا مگر حکم خداوندی سے فرعون کا لشکر اس دریا میں غرق ہو گیا۔ اس طرح اللہ نے اپنے نبی اور ان کے حواریوں (ایمان لانے والے) کو بچا لیا۔

موسیٰ کو تیرے حکم سے دریا نے راہ دی
فرعون کو تو نے غرق کیا رودِ نیل کا

یدِبیضا:۔ ید کے معنی "ہاتھ" اور بیضا کے معنی "روشن" فرعون کے حکم پر حضرت موسیٰ کی آزمائش کے وقت بچپن میں ان کی ہتھیلی جل گئی تھی جس کے عوض میں خداوند تعالیٰ نے آپ کو یہ معجزہ عطا فرمایا تھا۔ جب آپ ہتھیلی کو بغل کے اندر چھپا کر نکالتے تھے تو وہ داغ سورج کی روشنی کی طرح چمکتا تھا۔ اس معجزہ کو "یدِ بیضا" کہا جاتا ہے۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں (اقبال)

۱۲۔ وادئ ایمن

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

چونکہ یہ وادی کوہِ طور کے داہنی طرف واقع ہے اس لئے اس کو "وادئ ایمن" کہتے ہیں۔ ("ایمن" عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "داہنی طرف") ایک روز سخت سردی پڑ رہی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اہلیہ کے ہمراہ وطن کی طرف لوٹ رہے تھے کہ انھیں کچھ دوری پر آگ جلتی ہوئی نظر آئی۔ حضرت موسیٰ نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو میں آگ لاتا ہوں تاکہ لکڑیوں کو جلا کر ہاتھ پاؤں سینک لیں۔ جب وہ وہاں پہنچے تو غیب سے آواز آئی اے موسیٰ میں اللہ ہوں یہیں پر ان کو پیغمبر ہونے کی خوشخبری دی گئی۔ حضرت موسیٰ جسے آگ سمجھ رہے تھے دراصل وہ آگ نہ تھی بلکہ تجلی الٰہی تھی۔

؎ کھینچے خود بخود جانبِ طورِ موسیٰ
کشش تری اے شوقِ دیدار کیا تھی (اقبال)

؎ شرارے وادئ ایمن کے تو بوتا تو ہے لیکن
نہیں ممکن کہ پھوٹے اس زمیں سے تخمِ سینائی (اقبال)

۱۳۔ کوہِ طور، طورِ سینا

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے
(اقبال)

کوہ طور فلسطین کے ایک پہاڑ کا نام ہے جس پر خدا کے پیغمبر حضرت موسیٰ اللہ سے ہمکلام ہوتے تھے۔ اسی پہاڑ پر انھوں نے خدا کا جلوہ بھی دیکھا۔ واقعہ اس طرح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو خدا کی طرف سے حکم ملا کہ تم کوہِ طور پر جا کر تیس دن تک ہماری عبادت کرو اس کے بعد ہم تمہیں "توریت" نام کی ایک آسمانی کتاب عنایت کریں گے۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ کے حکم سے وہ کوہِ طور پر گئے اور اپنی امت بنی اسرائیل کو خوب سمجھا کر ہدایت کر گئے کہ میرے پیچھے تم پھر گمراہ مت ہو جانا۔ کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ سے ہمکلام ہوتے۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ کا لقب "کلیم اللہ" ہے یعنی اللہ سے بات کرنے والا۔ بات چیت کا سلسلہ عرصہ تک چلتا رہا ایک روز حضرت موسیٰ کے جی میں آیا کہ میں اللہ کا دیدار بھی کروں چنانچہ انھوں نے فرمایا "رَبِّ اَرِنِی" یعنی اے رب تو مجھے اپنا جلوہ دکھا دے۔ خدا کی طرف سے جواب ملا "لَنْ تَرٰانِی" یعنی تم مجھے نہیں دیکھ سکو گے۔ حضرت موسیٰ خدا کا جلوہ دیکھنے کے لئے بار بار اصرار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی ضد پر اللہ نے فرمایا کہ اگر تم جلوہ دیکھنا ہی چاہتے ہو تو سامنے کے پہاڑ پر نظر کرو اگر وہ پہاڑ جس کا نام طور سینا ہے اپنی جگہ پر قائم رہا تو سمجھ لینا کہ تم مجھ کو دیکھ سکو گے ورنہ نہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں تجلی نور الٰہی جلوہ گر ہوئی پہاڑ جل کر راکھ ہو گیا اور حضرت موسیٰ اس تجلی کی تاب نہ لا کر بیہوش ہو گئے۔ کافی دیر بعد جب ہوش آیا تو اللہ سے اپنی گستاخی کی معافی مانگی اور آئندہ کے لئے اس طرح کی ضد کرنے سے توبہ کی۔

اَڑ کے بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی
(اقبال)

ے کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی (غالب)

ے وہ موسیٰ تھے کہ غش کھا کے گر پڑے وہاں لن ترانی کا
تمہارے طالبِ دیدار یہ دعویٰ نہ مانیں گے (شیدا)

۱۴۔ مَنّ و سلویٰ

حضرت موسیٰ اور ان کی امت "بنی اسرائیل" چالیس سال تک فرعون کے ظلم و ستم سے تنگ آکر جنگلوں اور بیابانوں میں پھرتی رہی۔ کھانے پینے کا جو کچھ ذخیرہ ان کے پاس تھا جب وہ ختم ہوگیا تو آپ کی امت نے گریہ وزاری شروع کر دی اور حضرت موسیٰ سے دعا کے لئے کہا۔ آپ کی دعا سے آسمان سے اترنے والا ایک خاص قسم کا کھانا ملنے لگا جس کو "من و سلویٰ" کہتے ہیں۔ ایک خاص قسم کی میٹھی رطوبت کی موٹی تہ درختوں کے پتے پر جم جاتی تھی اس کو "من" کہتے تھے۔ شام کے وقت روزانہ ہزاروں بٹیر انھیں کھانے کے لئے آتے مگر حکم خداوندی سے وہ سب وہیں گر کر کباب بن جاتے ان کو بنی اسرائیل "سلویٰ" کہتے تھے۔ یہ دونوں چیزیں چونکہ خدا کی دی ہوئی نعمتیں تھیں اس لئے بے انتہا لذیذ تھیں لیکن بنی اسرائیل ان کو عرصہ تک کھاتے کھاتے گھبرا گئے اور ناشکری پر اتر آئے۔ کہنے لگے اے موسیٰ ہمیں تو اب اس کے علاوہ کوئی دوسری غذا دیجئے۔ موسیٰ نے ہر چند سمجھایا مگر وہ بدکلامی اور خدا کی ناشکری کرتے رہے۔ خدا کو یہ بات ناگوار لگی اور "من و سلویٰ" آنا بند ہوگیا۔ قرآن پاک میں اس کا بیان تفصیل کے ساتھ ہے۔

۱۵۔ شاخِ طوبےٰ

طوبےٰ بہشت کے ایک درخت کا نام ہے جس کی شاخ بہشت کے ہر محل تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس سے جنتیوں کو طرح طرح کے پھل اور خوشبو حاصل ہوگی۔

ے

ہوا سر سبز آگے یار کے سرو گلستاں کب
کہ نسبت دور کی طوبیٰ کو اس کے نخل قد سے ہے

(میر تقی میر)

۱۶۔ شق القمر

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دین کو آغوش میں

ہجرت سے پانچ سال قبل کی بات ہے کہ ایک رات ابوجہل جو آنحضرت کا سب سے بڑا مخالف تھا، حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر بولا کہ محمدؐ کوئی معجزہ دکھاؤ تاکہ میں تمہیں اللہ کا نبی تسلیم کروں اور ایمان بھی لاؤں۔ ہم جانتے ہیں کہ تم بہت بڑے جادوگر ہو اور تمہارا جادو زمین پر تو خوب چلتا ہے اب تم آسمان کی طرف دیکھو اور چاند کے دو ٹکڑے کر دکھاؤ آپؐ نے انگشتِ شہادت سے اشارہ کیا اور چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ابوجہل بولا اچھا اب ان کو ملا دو۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اشارہ کیا چاند جیسا تھا ویسا ہی پھر ہو گیا۔ یہ دیکھ کر ساتھ میں آیا ہوا یہودی تو مسلمان ہو گیا مگر اپنی عادت کے مطابق ابوجہل بولا "محمدؐ تم نے ہماری آنکھوں پر جادو کر دیا ہے۔ میں تو مختلف لوگوں سے اس کی تصدیق کروں گا کہ کیا ان لوگوں نے بھی چاند کو دو ٹکڑوں میں دیکھا ہے"۔ بہت سے لوگوں سے ابوجہل نے دریافت کیا سب نے اس کی تصدیق کی۔ مگر وہ پھر بھی ایمان نہیں لایا۔

۱۷۔ شہر بابل

"بابل" قدیم زمانہ کے ایک مشہور شہر کا نام تھا جو کئی میلوں میں بسا ہوا تھا۔ یہ شہر نمرود اور ضحاک بادشاہوں کا پایہ تخت بھی رہا ہے۔ بابل اپنی خوبصورتی اور رونق کے لئے بہت مشہور تھا۔ آج بھی اس کے کھنڈرات عراق میں دریائے فرات کے مشرقی کنارے پر یعنی بغداد کے جنوب و مغرب میں موجود ہیں۔

۱۸۔ صبرِ ایوبؑ

حضرت ایوب علیہ السلام ایک پیغمبر گزرے ہیں وہ نہایت دولت منداور صاحب اقبال تھے ۔ آپ ہزاروں اونٹوں، بکریوں اور غلاموں کے مالک تھے ۔ ان کے یہاں اولاد بھی تھی۔ لیکن اللہ اپنے محبوب بندوں کو سخت آزمائش میں بھی مبتلا کر دیتا ہے ۔ آپ کی ساری دولت اونٹ، بکریاں اور تمام جائداد تباہ ہوگئی یہاں تک کہ اولاد بھی مرگئیں ۔ مکان کھنڈر ہوگیا ۔ وہ ایک مہلک بیماری میں اس حد تک مبتلا ہوئے کہ جسم میں کیڑے پڑ گئے مگر وہ صبر کرنے والے خدا کے سچّے بندے اور پیغمبر تھے اتنی مصیبتوں کے بعد بھی انھوں نے اُف تک نہ کی ۔ خدا ان کے اس صبر اور شکر سے بہت خوش ہوا۔ اس نے دوبارہ ان کو مال ومتاع صحت اور اولاد سے خوب نوازا ۔ بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۔ حضرت ایوب علیہ السلام کا صبر مشہور ہے اسی لئے وہ "صابر" کہلاتے ہیں :۔

کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی
خم آئے گا، صراحی آئے گی تب جام آئے گا

۱۹۔ طوفانِ نوحؑ

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا
نوحِ نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

حضرت نوح علیہ السلام ایک طویل العمر پیغمبر تھے ۔ انھوں نے اپنی قوم کو خدا کے بتلائے ہوئے طریقے پر عمل کرنے اور راہِ راست پر لانے کی ہر چند کوشش کی مگر بہت کم لوگوں نے ان کی بات مانی ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے انھیں خدا کے عتاب سے بھی ڈرایا مگر ان

پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس وقت خداوند کریم کا حکم ہوا کہ اے نوح ان لوگوں کو اب کچھ نہ کہو بلکہ ایک کشتی تیار کرو جس میں ہر ایک جاندار کا ایک ایک جوڑا اور ان لوگوں کو جو خدا پر ایمان لائے ہیں بٹھالو۔ عنقریب ان پر ہمارا عتاب نازل ہونے والا ہے۔ جس سے صرف کشتی میں سوار ہونے والے ہی محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ پھر بارش اور طوفان کا اتنا زبردست سلسلہ شروع ہوا کہ ہر طرف پانی ہی پانی تھا وہ تمام لوگ غرقاب ہو گئے جو خدا کے منکر تھے۔ ان میں حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا بھی تھا۔ یہ کشتی چھ ماہ تک اللہ کی حفاظت میں پانی پر تیرتی رہی جب طوفان ختم ہوا تو یہ کشتی کوہ جودی (عراق) پر آکر ٹھہر گئی۔ رفتہ رفتہ جب طوفان اور سیلاب جو عذابِ الٰہی کی صورت میں نازل ہوا تھا کم ہوا تو کشتی کے تمام سوار اور حضرت نوحؑ زمین پر اترے۔ اللہ کی طرف سے انھیں پھر ہر طرح کا آرام اور سہولتیں نصیب ہوئیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی امت کی گمراہی اور سنگ دلی پر بہت روتے تھے اسی لئے آپ کو "نوح" کے نام سے پکارا گیا جس کے معنی ہوتے ہیں "نوحہ اور گریہ وزاری کرنا"۔

ے ہے جوشِ گریہ، تو کریں کیوں نہ اہلِ شہر
کشتی میں مثلِ نوح علیہ السلام کوچ (ناظم)

۲۰۔ غارِ حرا

مکہ معظمہ کے قریب ایک پہاڑ میں غارِ حرا واقع ہے نبوت ملنے سے پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی غار میں جاکر خدا کی عبادت کیا کرتے تھے اور اسی غار میں آپ کو نبی ہونے کی بشارت ملی۔ سب سے پہلے قرآن پاک کی سورۃ "اقرا" کی ابتدائی آیتیں اسی غارِ حرا میں نازل ہوئیں۔ ے

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

(حالی)

۲۱۔ کوہ کَن، جوئے شِیر، شیریں فرہاد

وہی اک حسن ہے، لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا، بیستوں بھی کوہ کن بھی ہے (اقبالؔ)

فرہاد فارس کا باشندہ تھا۔ اس کو کوہ کن بھی کہتے ہیں۔ فرہاد شیریں پر عاشق تھا۔ شیریں ایک شہزادی تھی جس کی شادی خسرو پرویز سے طے ہو چکی تھی۔ فرہاد شیریں کے عشق میں رات دن تڑپتا تھا۔ خسرو پرویز کو جب اس کا علم ہوا تو اُس نے فرہاد کو بلوا کر اس سے کہا تم کو اگر شیریں سے سچی محبت ہے اور اسے حاصل کرنا چاہتے ہو تو "کوہ بیستون" کے پتھروں کو کاٹ کر شیریں کے محل تک ایک نہر تیار کرو۔ فرہاد نے اپنا تیشہ اٹھایا اور جی جان سے نہر تیار کرنے میں لگ گیا۔ خسرو کو یقین تھا کہ فرہاد اس ناممکن کام کو کبھی انجام نہیں دے سکے گا لیکن اس نے دیکھا کہ برسوں کی جان توڑ محنت کے بعد فرہاد نہر تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے تو اُس نے ایک مکّار عورت کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ شیریں مر گئی۔ فرہاد نے جب یہ خبر سنی تو برداشت نہ کر سکا اور اسی وقت سر پہ تیشہ مار کر اپنی جان دے دی۔ دوسری طرف جب شیریں کو فرہاد کے مرجانے کی خبر ملی تو محل کے اوپری منزل سے گر کر وہ بھی جاں بحق ہو گئی۔

۱۔ سر دیجیے راہِ عشق میں پر منہ نہ موڑیے
پتھر کی سی لکیر ہے یہ کوہ کَن کی بات (اقبالؔ)

۲۔ زندگانی کی حقیقت کوہ کَن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی (اقبالؔ)

۳۔ گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ (اقبالؔ)

۲۲۔ قیس یا مجنوں

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا ، محمل ہے بے لیلا ترا (اقبالؔ)

مجنوں کا اصل نام قیس بن عامر تھا۔ وہ لیلیٰ کے عشق میں دیوانہ تھا۔ چونکہ قیس ایک اچھا شاعر تھا۔ اس لئے وہ لیلیٰ کی محبت میں اشعار کہتا اور جنگل جنگل مارا پھرتا۔ اس کی دیوانگی کو دیکھ کر سب اسے "مجنوں" کہنے لگے۔

قیس (مجنوں) لیلیٰ کی جدائی میں رات دن تڑپتا اور آخری سانس تک اسی کا دم بھرتا رہا۔ ؁ ہجری میں اس کا انتقال ہوا۔

ؔ دیکھتا دامنِ صحرا میں جو وحشت میری
سر اٹھاتا نہ گریبان سے مجنوں اپنا (جرأتؔ)

۲۳۔ گلزارِ ابراہیم، نارِ نمرود

ابراہیم علیہ السلام آپ کا نام اور "خلیل اللہ" لقب تھا جس کے معنی ہوتے ہیں "اللہ کا دوست"۔ آپ اللہ کے پیغمبر تھے ہر نبی نے خدا کے ایک ہونے اور اس کی بنائی ہوئی باتوں کا اعلان کیا ہے۔ آپ نے بھی اللہ کے ایک ہونے اور صرف اسی کے آگے سر جھکانے کی تعلیم دی۔ اُس زمانہ میں ایک بادشاہ تھا نمرود۔ وہ انتہائی مغرور اور بہت بڑا بُت پرست تھا وہ اپنے کو خدا کہلواتا تھا۔ جو اس کی مخالفت کرتا اسے قتل کرا دیتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ ایک نہ مانا اور طرح طرح کے مظالم ڈھانے لگا۔ ایک روز اس جرم میں کہ ابراہیمؑ نے ہمارے بتوں کو توڑا ہے، ہزاروں من جلتی ہوئی لکڑیوں کے الاؤ میں ڈال دیا۔ نمرود نے اپنا رعب غالب کرنے کے لئے دور دور تک منادی

کرادی تھی کہ لوگ آکر ابراہیم علیہ السلام کو جلتا ہوا دیکھیں۔ لیکن آنے والے ہزاروں لوگوں نے دیکھا کہ اللہ نے اپنے محبوب بندے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے اس آگ کو گلزار بنا دیا اور وہ مسکراتے ہوئے آگ کے شعلوں سے باہر نکل آئے۔ نمرود کی لڑکی اور سیکڑوں افراد اس معجزہ کو دیکھ کر خدا پر ایمان لے آئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتِ توحید کو قبول کیا۔ ۱؎ نارِ نمرود کو کیا گلزار - دوست کو یوں بچالیا تونے (داغ)

۲؎ باغ و بہار آتشِ نمرود کو کیا
مشکل کے وقت حامی ہوا تو خلیل کا

۳؎ آگ ہے، اولاد ابراہیمؑ ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے (اقبال)

۲۴۔ گنجِ قارون

زیرِ زمین سے آتا ہے جو گل سو زر بکف - قارون نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا (آتش)

قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچازاد بھائی تھا۔ لیکن خدا کا منکر تھا۔ اس کے پاس اس قدر دولت تھی کہ اس کے خزانوں کی کنجیاں کئی اونٹوں پر لدی رہتی تھیں۔ وہ نہایت مغرور، ظالم اور بخیل تھا۔ غریبوں و محتاجوں کا بھی کچھ خیال نہیں کرتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے بہت سمجھایا۔ مگر وہ نہ مانا۔ ظلم اور نافرمانی کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ ایک روز عتابِ الٰہی سے وہ اپنی ساری دولت کے ساتھ ہزاروں من مٹی کے نیچے دب گیا۔ بطور سزا اپنے ہی خزانوں کے بوجھ تلے وہ قیامت تک زمین میں دھنستا جائے گا اور وہی خزانے سانپ بچھو بن کر اس کو قیامت تک ڈستے بھی رہیں گے۔ قارون کے اس انجام کو دیکھ کر دولت کی لالچ رکھنے والوں نے اللہ سے توبہ کی اور اس کا شکر بجا لائے کہ اس نے اپنی رحمت سے ہمیں بچالیا۔

۲۵۔ لحنِ داؤدی

داؤد حضرت سلیمان علیہ السلام کے والد کا نام ہے۔ آپ پیغمبر تھے۔ آسمان سے نازل ہونے والی چار کتابوں میں سے ایک کتاب جس کا نام "زبور" ہے آپ پر نازل ہوئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی آواز نہایت دلکش تھی۔ جب آپ زبور پڑھتے تو لوگ جوق در جوق آکر سنتے اور ان کی خوش الحانی سے مسحور ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ "لحنِ داؤدی" آج تک مشہور ہے اور بطور تلمیح مستعمل ہے۔

۲۶۔ ماہِ نخشب

حکیم ابن عطانے پارے کی طرح کے کچھ اجزاء ملاکر ایک چاند بنایا تھا۔ یہ چاند دو ماہ تک ہر رات کو ایک کنوئیں سے جو کوہِ سیام کے نیچے واقع تھا نکلتا تھا اس کی روشنی بارہ میل تک پہنچتی تھی۔ نخشب ملک ترکستان کے ایک شہر کا نام ہے وہ کنواں جہاں سے یہ چاند بذریعہ طلسم نمودار ہوتا تھا۔ شہر نخشب سے چھ میل کی دوری پر تھا۔

ع
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
(غالب)

۲۷۔ منصور حلّاج

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

منصور ایک بہت بڑے مجذوب اور کامل ولی تھے۔ آپ عرب اور فارس کے کئی شہروں میں رہے۔ ایک دن آپ اپنے ایک دوست کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جو پیشے کا حلّاج (دھنا) تھا۔ وہ روئی کا دھننا چھوڑ کر کسی ضرورت سے باہر گیا اتنے میں منصور

نے روئی کی طرف کچھ اشارہ کیا، روئی خود بخود دھننے لگی۔ اُن کی اس کرامت کو دیکھ کر لوگ انھیں "حلّاج" کہنے لگے۔ چونکہ یہ ایک مجذوب تھے اس لئے ان کی زندگی میں ایک دور ایسا بھی آیا جب ان پر پوری شدّت کے ساتھ فنافی اللہ کا جذبہ غالب ہوگیا اور عالمِ جذب میں "انا الحق" (میں خدا ہوں) کہنے لگے۔ چونکہ آپ کا "انا الحق" کہنا شریعت کی رو سے بالکل ناجائز تھا۔ اس لئے بادشاہِ وقت نے مفتی سے فتویٰ لے کر ان کو سولی پر چڑھا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے لہو کے قطرہ سے "انا الحق" کی صدا آتی تھی۔ یہ واقعہ ۳۰۹ھ کا ہے۔

۲ھ
رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلّاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا
(اقبال)

۳ھ
منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی
(اقبال)

۲۸۔ مُرغِ آتشیں یا قفنس

یہ ایک پرندہ ہے اس کو مُرغِ آتشیں یا قفنس بھی کہتے ہیں۔ حکما نے اس کی آواز سے علم موسیقی نکالا ہے۔ یہ ایک ہزار سال تک زندہ رہتا ہے۔ اس کی مادہ نہیں ہوتی۔ اس پرندے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب وہ اپنی پوری عمر کو پہنچ جاتا ہے تو لکڑیاں جمع کرکے اس کے اندر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی چونچ میں بہت سے سوراخ ہوتے ہیں۔ ہر سوراخ سے وہ مختلف طرح کی راگ نکالتا ہے۔ چنانچہ جب دیپک راگ نکالتا ہے تو ان لکڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ پرندہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے پھر جب قدرتِ الٰہی سے بارش ہوتی ہے تو اس خاک میں سے ایک انڈا پیدا ہوتا ہے جس سے پھر اُسی قسم کا ایک پرندہ پیدا ہوتا ہے۔

۲۹۔ ہاروت و ماروت اور زہرہ و مشتری

ہاروت و ماروت دو فرشتے تھے۔ انھیں اپنی عبادت پر بہت ناز تھا اور انھیں خدا سے

شکایت تھی کہ انسانوں کا مرتبہ فرشتوں کے مقابلہ میں بلند تر کیوں ہے چنانچہ دونوں نے متکبرانہ انداز میں خدا سے عرض کیا کہ اگر تو ہمیں دنیا میں بھیج دے تو ہم اپنی عبادت اور تقویٰ سے ثابت کر دیں گے کہ فرشتوں کا درجہ انسانوں سے افضل ہے۔ خداوند تعالیٰ نے انھیں سمجھایا کہ دنیا، جائے امتحان ہے انسان کو بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے تم دنیا میں جا کر ثابت قدم نہیں رہ سکو گے۔ ہاروت و ماروت نہ مانے۔ ان کو اللہ نے دنیا میں آزمائش کے لئے بھیج دیا۔ کچھ دنوں تک تو وہ عبادت و ریاضت میں مصروف رہے۔ خدا نے ان کے امتحان کے لئے زہرہ اور مشتری نامی دو مغنیہ کو ان کی بستی میں بھیجا۔ جو اپنے حسن و جمال میں یکتا اور خوش گلوئی میں بے مثال تھیں۔ ان کی شہرت سن کر ہاروت و ماروت بھی اس ارادہ سے گئے کہ صرف ایک بار ان کا گانا سنیں گے۔ لیکن پہلی ہی بار میں اس قدر متاثر ہوئے کہ ہر شب وہ ناچ گانے کی محفلوں میں شریک ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہ عبادتِ الٰہی سے غافل ہو گئے۔ "زہرہ" و "مشتری" کے عشق میں اس قدر دیوانے ہو گئے کہ ان کی نیتوں میں فتور آ گیا اور قریب تھا کہ گناہ کبیرہ میں ملوث ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے زہرہ اور مشتری کو آسمان پر اٹھا لیا۔ یہی زہرہ اور مشتری نامی دو تارے آج بھی آسمان پر دیکھے جا سکتے ہیں دونوں فرشتے یعنی ہاروت و ماروت اپنے دعوے میں ناکامیاب ہوئے۔ چنانچہ ان کے غرور اور بداعمالیوں کی وجہ سے قیامت تک کے لئے انھیں "چاہِ بابل" میں الٹا لٹکا دیا گیا ہے۔ یہ کنواں آج بھی بابل کے کھنڈرات میں ہے جہاں یہ دونوں انسانی آنکھوں سے پوشیدہ اپنی سزا بھگت رہے ہیں۔ ہاروت و ماروت اپنے زمانے کے بہت بڑے جادوگر بھی مانے جاتے تھے۔ چنانچہ اس کنویں پر جہاں وہ بطور سزا لٹکے ہوئے ہیں وہاں آج بھی جادو سیکھنے والے جا کر نذر و نیاز پیش کرتے ہیں اور جادو میں مہارت حاصل کرنے کے لئے منت مانتے ہیں۔ "زہرہ" کا دوسرا نام "ناہید" ہے جس کو "مطربِ فلک" بھی کہا جاتا ہے :-

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

(مومنؔ)

۳۰- ہابیل و قابیل

یہ دونوں سگے بھائی اور حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ اُس زمانہ میں لوگ خدا کی راہ میں کی جانے والی قربانیوں کو چند علامتوں کے ذریعہ دیکھتے تھے کہ آیا ہماری قربانی بارگاہِ خداوندی میں قبول ہوئی یا نہیں۔ وہ بہت خوش نصیب اور قابلِ تعظیم سمجھا جاتا تھا جس کی قربانی قبول ہو جاتی تھی۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ہابیل اور قابیل دونوں نے خدا کی راہ میں جانوروں کی قربانی دی۔ ہابیل کی قربانی قبول ہو گئی جب کہ قابیل کی قربانی ان کے عقیدہ کے مطابق قبول نہیں ہوئی۔ چنانچہ قابیل کو ہابیل سے حسد پیدا ہوا۔ اس نے ہابیل کو قتل کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قتل دنیا کا سب سے پہلا قتلِ انسانی ہے۔ قابیل اپنے بھائی کی لاش کو چھپانے کے لئے پریشان تھا کہ کیا کرے اس اثناء میں ایک کوّے نے اپنی چونچ سے زمین کھود کر ایک دوسرے مرے ہوئے کوّے کو مٹّی میں دبا دیا۔ قابیل نے جب یہ دیکھا تو اُس نے بھی گڈھا کھود کر ہابیل کو دفن کر دیا۔

تلمیحات (حصّہ ب)

(ترتیب حروف تہجّی کے لحاظ سے)

جیساکہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اردو ادب تلمیحات سے مالا مال ہے۔ طوالت کے پیشِ نظر ہر ایک کا تفصیل سے ذکر کرنا مشکل ہے۔ اس لئے مذکورہ بالا تلمیحات کے علاوہ ذیل میں اُن خاص خاص تلمیحات کے متعلق مختصراً بتایا گیا ہے جو اردو ادب میں مستعمل ہیں ان میں سے بیشتر کے ساتھ تلمیحی اشعار بھی بطور مثال پیش کئے گئے ہیں۔ علامہ اقبال کے یہاں ہمیں جس قدر تلمیحات ملتی ہیں اردو کے دیگر شعراء کے کلام میں اتنی نہیں ملتیں۔

آپ اس کا اندازہ اقبال کے ان تلمیحی اشعار سے بھی کر سکتے ہیں جو ذیل میں مثالاً پیش کیے گئے ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے نظریہ فکریہ، فلسفہ اور پیغام کو تلمیحات کے ذریعہ نہ صرف دلکش اور پُر اثر انداز میں پیش کیا ہے بلکہ معنی و مفہوم کے اعتبار سے دریا کو کوزہ میں بھر دیا ہے۔ ان تلمیحات کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کئے بغیر اشعار کی گہرائی تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔

۱۔ ابرہہ

بادشاہ حبشہ (ایتھوپیا) کے ایک اعلا فوجی افسر کا نام ہے جو عیسائی تھا اس نے یمن کی راجدھانی "صنعا" میں ایک شاندار گرجا گھر تعمیر کرایا۔ مگر خانہ کعبہ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر اسے ایک طرح کی جلن اور عداوت پیدا ہوئی چنانچہ ۵۷۰ء میں ابرہہ خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے ارادہ سے ایک بڑا لشکر لے کر چلا، مگر اللہ نے بہت بڑی تعداد میں ایسے پرندوں کو بھیجا جس نے ان پر پتھریلی کنکریاں برسائیں جس کے نتیجہ میں ابرہہ کی فوج بھاگ بھی نہ سکی اور وہیں تباہ و برباد ہو گئی۔ آسمان پر اڑتے ہوئے ان عجیب و غریب پرندوں کو قرآن پاک میں "ابابیل" کہا گیا ہے اس طرح خداوند تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو ابرہہ کے ناپاک ارادے سے بچالیا۔ یہ واقعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے صرف پچاس روز پیشتر کا ہے اس وقت آنحضرت ؐ کے دادا عبدالمطلب جو قریش قبیلہ کے سردار تھے۔ خانہ کعبہ کے متولی اعظم تھے

؎ اپنے کعبہ کی حفاظت تمہیں خود کرنی ہے + اب ابابیلوں کا لشکر نہیں آنے والا

۲۔ ابراہیم بن ادہمؒ ۷۹۵ء۔ ۸۹۴ء

بلخ کے ایک بادشاہ کا نام جس نے تخت و تاج چھوڑ کر فقیری اختیار کر لی۔ اپنی ریاضت اور عبادت سے بہت بڑے صوفی اور بزرگ کہلائے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے بقول آپ فقرا کے تمام علوم و اسرار کی کنجی ہیں۔ ابراہیم بن ادہم کا قول تھا کہ جب

گناہ کا ارادہ کرو تو خدا کی بادشاہت سے باہر نکل جاؤ"۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کا مزار سوقین (جرمنی) میں ہے۔

۳۔ آزر :۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام ہے جو اپنے زمانہ کے مشہور بت تراش۔ بت فروش اور بت پرست تھے۔ قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے۔ ؎

بتکدہ پھر بعد مدّت کے مگر روشن ہوا نورِ ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا

۴۔ ارسطو

یونان کے رہنے والے ایک مدبّر اور قابل شخص کا نام جو سکندر کا اتالیق اور افلاطون کا شاگرد تھا۔ ارسطو فلسفی، ریاضی داں، اور ماہر فلکیات تھا۔ اس نے اٹھارہ سال کی عمر سے ہی افلاطون کی شاگردی اختیار کی اور اتنی قابلیت پیدا کرلی کہ بہت سے علوم پر کتابیں لکھیں۔

۵۔ افراسیاب

ملک توران کے ایک افسانوی بادشاہ کا نام جو نسلاً ترک تھا۔ اس نے ایک بڑی جنگ لڑکر ایران پر قبضہ کرلیا تھا۔ مگر کچھ سالوں بعد کیخسرو کے ہاتھوں قتل کردیا گیا۔

۶۔ افلاطون :۔ یونان کے ایک قابل اور فلسفی کا نام ہے جو ارسطو کا استاد اور سقراط کا شاگرد تھا۔ اس کی مشہور تصنیف "جمہوریت" ہے۔

۷۔ اسرافیلؑ

نام اس فرشتہ کا جو قیامت کے روز "صور" پھونکے گا جس کی آواز سے

تمام مخلوق فنا ہو جائے گی پھر خداوند تعالیٰ کے حکم سے آپ دوبارہ تمام مخلوق کو زندہ کرنے کے لئے صور پھونکیں گے۔

ع حضورِ حق میں اسرافیلؑ نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا (اقبال)

۸۔ عزرائیل :۔ نام ایک مقرب فرشتہ کا جو اللہ کی مخلوق کی روح قبض کرنے پر مامور ہے۔

۹۔ میکائیل :۔ خدا کے ایک مقرب فرشتہ کا نام ہے جو لوگوں کو رزق تقسیم کرتے ہیں۔

۱۰۔ جبرئیل :۔ اللہ کے اُس مقرب فرشتہ کا نام ہے جو رسولوں تک خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اس عمل کو "وحی" کہتے ہیں۔ ع

آتی ہے صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی (اقبال) اہلِ فراق کے لئے عیشِ دوام ہے یہی

۱۱۔ ابوالہول

مصر کے آثارِ قدیمہ میں "ابوالہول" بہت مشہور ہے۔ اس کی لمبائی ۱۸۹ فٹ اور اونچائی ۶۵ فٹ ہے۔ یہ مجسمہ تین ہزار سال قبل مسیح ایک بڑی چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ اس کے پنجے اور دھڑ شیر کے ہیں اور سر انسان کا۔ سورج دیوتا کی حیثیت سے اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس کا کافی حصہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے اب یہ ایک ہیبت ناک منظر پیش کرتا ہے۔ اسی وجہ سے عربوں نے اس کا نام "ابوالہول" یعنی "خوف کا باپ" رکھ دیا۔ ع

خود ابوالہول نے یہ نکتہ سکھایا مجھ کو — وہ ابوالہول کہ ہے صاحبِ اسرارِ قدیم
(اقبال)

۱۲۔ ابوجہل

(۶۲۳ء۔ ۲ھ) مکے کا ایک قریشی سردار تھا جو اسلام اور نبی اکرمؐ کا دشمن

تھا۔ مکہ میں اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابیوں کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ وہ بدر کی لڑائی میں مارا گیا۔

۱۳۔ آسیہ

مصر کے بادشاہ فرعون کی بیوی کا نام ہے۔ وہ پوشیدہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئی تھی۔ فرعون کو جب اس کا علم ہوا تو اُس نے اپنی بیوی آسیہ کو بڑی اذیتیں پہنچائیں اور پھر قتل کر دیا۔

۱۴۔ الیاسؑ

حضرت الیاس علیہ السلام ایک پیغمبر ہیں جو خضر علیہ السلام کے چچازاد بھائی ہیں۔ وہ خضر علیہ السلام کی طرح قیامت تک زندہ رہیں گے۔ جس طرح تری کی خدمت حضرت خضر علیہ السلام کے سپرد ہے اسی طرح خداوند تعالیٰ نے حضرت الیاس کو خشکی کی خدمت سپرد کی ہے۔ ؎

خضر بھی بے دست و پا، الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو

(اقبالؔ)

۱۵۔ اہرامِ مصر

اہرام، ہرم کی جمع ہے۔ عربی زبان میں اس کے معنی ہیں "پرانی چیز" اہرام مصر قدیم مصری بادشاہوں (فراعنہ) کے مخروطی شکل کے مقبرے ہیں جو کئی میل کے علاقے میں واقع ہیں۔ جب عربوں نے مصر فتح کیا تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا چیز ہے اس لئے ان کو "اہرام" کہنے لگے۔ ؎

اہرام کی عظمت سے نگونسار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر؟

(اقبالؔ)

۱۶۔ ابو سینا

پورا نام ابو علی الحسین بن سینا ۔ بو علی سینا کے نام سے بھی آپ یاد کئے جاتے ہیں ۔ بخارا کے قریب اخشنہ نامی ایک بستی میں پیدا ہوئے ۔ وہ بہت نامور طبیب، ریاضی داں ، فلسفی اور مفکر تھے ۔ انھوں نے تقریباً ۹۹ کتابیں لکھیں جن میں بیشتر علمِ طب (یونانی طریقۂ علاج) کے موضوع پر ہیں ۔ اب تک ان کی بہت سی کتابوں کے ترجمے یورپی زبانوں میں ہو چکے ہیں :۔

فردوس میں رومی سے کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش
(اقبال)

۱۷۔ بہرام گور

۴۲۰ء تا ۴۴۰ء یعنی ۲۰ سال تک بہرام ایران کا ساسانی فرمانروا رہا۔ یہ اپنی شجاعت اور بہادری کے لئے مشہور ہے ۔ باپ کے مرنے کے بعد جب اس کے تینوں بھائیوں میں تخت نشینی کا جھگڑا کھڑا ہوا تو درباریوں نے یہ طے کیا کہ دو بھوکے شیروں کے درمیان تاج کو رکھ دیا جائے جو اٹھالے وہی تخت و تاج کا وارث بنے چنانچہ دو بھائیوں کی ہمت نے جواب دے دیا مگر بہرام گور اٹھالایا اور تخت کا وارث بنا ۔

۱۸۔ بایزید بسطامی

ولادت ۷۴۵ء وفات ۸۷۴ء آپ بسطام میں پیدا ہوئے ۔ مذہبی علوم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے دنیا ترک کر دی ۔ جنگلوں اور پہاڑوں کے غار میں برسوں رہے ہیں عبادت و ریاضت کرتے رہے ۔ تصوف میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے بغداد جنیدؒ فرماتے ہیں کہ "آپ ہم میں ایسے ہیں جیسے جبرئیل علیہ السلام فرشتوں میں"۔

عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں ــــ شکوہِ سنجر و فقرِ جنیدؒ و بسطامیؒ (اقبال)

۱۹۔ بہزاد

ایران کے ایک مشہور مصوّر کا نام ۔ وہ کئی درباروں میں مصوّر کی حیثیت سے رہا۔ بہزاد کی تصویروں میں خطوط کی نفاست اور زیبائی دیکھ کر چینی فن کاروں کی یاد آتی ہے :۔

خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
میخانۂ حافظ ہو کہ بتخانۂ بہزاد

۲۰۔ بیت العتیق

مراد "پرانا گھر"۔ خانۂ کعبہ سب سے پہلا اور پرانا مکان ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کو سب سے پہلے بنایا تھا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دوبارہ بنایا۔ اس لئے خانۂ کعبہ کو "بیت العتیق" کہتے ہیں۔ عتیق کے معنی کریم اور معزز کے بھی ہیں مسلمانوں کا یہی قبلہ ہے ۔

۲۱۔ بیت الحزن :۔ وہ گھر جس میں حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی میں گریہ وزاری کیا کرتے تھے۔

۲۲۔ بیت المقدس

معنی "پاک گھر" یہ نام ایک مسجد کا ہے جو ملک شام میں ہے اس کو "مسجدِ اقصیٰ" بھی کہتے ہیں۔ اس کی بناء حضرت داوٗد علیہ السلام نے ڈالی تھی اور تکمیل حضرت سلیمان علیہ السلام نے کی۔ یہود اور نصاریٰ ادھر ہی منہ کر کے عبادت کرتے ہیں پہلے مسلمانوں کا بھی یہی قبلہ تھا۔

۲۳۔ بلال حبشی رضؓ

نام ایک مشہور صحابی کا جو قوم حبش (افریقی) میں سے تھے چونکہ حضرت بلالؓ بہت

ہی عمدہ اذان دیا کرتے تھے اس لئے تاحیات آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت ہی مقبول اور خوش الحان موذن تھے :- سے

اقبالؔ کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے ؟ رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے۔

۲۴- بام مسیح

(چوتھا آسمان) مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھانے سے پہلے اللہ نے ان کو چوتھے آسمان پر اٹھا لیا - وہ زندہ ہیں اور قیامت کے قریب دنیا میں پھر آئیں گے۔

۲۵- پیر کنعاں :- حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔

۲۶- پیر سراندیپ :- (حضرت آدم علیہ السلام) چونکہ آدم علیہ السلام جنت سے نکال دیئے جانے کے بعد جزیرہ سراندیپ میں بھیجے گئے اس لئے ان کو پیر سراندیپ کہتے ہیں۔

۲۷- ثریّا

یہ سات ستاروں کا ایک جھرمٹ ہے جس کو ہندی میں "جھمکا" فارسی میں "پروین" اور عربی میں "ثریّا" کہتے ہیں۔ سے

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی (اقبالؔ) ثریّا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا۔

۲۸- جالینوس

۱۳۰ئہ تا ۲۰۰ئہ - یونان کے ایک مشہور طبیب اور فلسفی کا نام ہے کئی ملکوں میں وہ شاہی طبیب کی حیثیت سے رہے - ان کی تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف ہیں جو علم طب ، منطق ، صرف ونحو ، اخلاقیات ، فلسفہ ، اور ادب وغیرہ پر ہیں - جالینوس نے ارسطو اور افلاطون کی کچھ کتابوں کی شرح بھی لکھی ہے۔

۲۹۔ جودی

ایک پہاڑ کا نام ہے جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی بعد طوفان آکر ٹھہری تھی۔ طوفان کے ختم ہونے اور پانی کے اترنے کی خبر حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو کشتی میں سوار اُس کبوتر کے ذریعہ ملی جسے حضرت نوح علیہ السلام نے علاقے میں جاکر معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا واپسی میں وہ زیتون کی ایک شاخ اپنی چونچ میں دبا کر لایا تھا جو اس بات کی علامت تھی کہ بہت سی بستیاں اور پیڑ پودے جو پانی میں ڈوب گئے تھے اب ظاہر ہونے لگے ہیں۔ طوفان ختم ہو چکا ہے اور پانی بھی اتر گیا ہے۔ سر سید احمد خاں نے اپنے مضمون "امید کی خوشی" میں اس تلمیح کی طرف اشارہ کیا ہے " تیرے ہی نام سے جودی پہاڑ کی مبارک چوٹی کو عزت ہے۔ زیتون کی ہری ٹہنی کو جو وفادار کبوتر کی چونچ میں وصل کے پیغام کی طرح پہنچی، جو کچھ برکت ہے تیری ہی بدولت ہے"۔

۳۰۔ چنگیز

ترکستان کے ایک نہایت ہی ظالم بادشاہ کا نام ہے۔

؎ محکوم کے الہام سے اللہ بچائے — غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

؎ اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں — سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک (اقبال)

۳۱۔ چشتیؒ

۱۱۴۱ء۔ ۱۲۳۵ء پورا نام حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ہے آپ کا لقب خواجہ "غریب نواز" ہے۔ خواجہ اجمیری بھی کہے جاتے ہیں۔ چونکہ "چشتیہ" سلسلہ کے آپ بانی ہیں اس لئے "چشتی" کہلاتے ہیں۔ ہندوستان کے اولیاء کرام میں آپ کا مرتبہ سب سے اعلیٰ ہے۔ مذہبِ اسلام کی تبلیغ کے سلسلہ میں آپ چالیس درویشوں کے ساتھ ہندوستان

آئے اور اجمیر میں سکونت اختیار کی۔ آپ نے لاکھوں بے دین اور گمراہ لوگوں کو سچائی کا راستہ دکھایا۔ آج بھی ان کے مزار پر سیکڑوں عقیدت مند ہر روز فاتحہ اور نذرونیاز کے لئے آتے ہیں۔ ان میں ہندو، مسلمان اور سکھ سب ہی ہوتے ہیں۔ ؎

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا　　نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا　　جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے　　(اقبال)

۳۲۔ حافظ شیرازیؒ

(ولادت ۷۲۶ھ وفات ۷۹۱ھ) پورا نام شمس الدین تھا۔ ایران کی سرزمین نے بہت سے عالم، فلاسفر، صوفی، آرٹسٹ اور شاعر پیدا کئے۔ انھیں میں حافظ شیرازی بھی ایک ہیں۔ وہ اتابکوں کے عہد میں شیراز گئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔ تمام شعرائے ایران میں حافظ شیرازی زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز ہیں۔ رندی اور آزاد مشربی ان کی غزلیات کی جان ہیں۔ ان کے کلام میں ایسا خدائی جذبہ موجود ہے جو آئندہ واقعات کی خبر دیتا ہے۔ ان کی شراب کا ذکر جو بار بار ان کے کلام میں آتا ہے وہ شراب معرفت ہے۔ ان کا کلام عشقِ حقیقی اور معرفتِ الٰہی سے معمور ہے۔ ان کا مجموعہ کلام "دیوانِ حافظ" کے نام سے مشہور ہے۔

عمر خیام:۔ عمر خیام ایران کا مشہور شاعر جو اپنی رباعیات کے لئے مشہور ہے ان کی رباعیوں سے رندی اور سرمستی چھلکتی ہے۔

فردوسی:۔ ایران کے ان چار مذکورہ شعراء میں جو عناصر اربعہ کہلاتے ہیں فردوسی کا اہم مقام ہے۔ وہ مناظر رزم و بزم کی عکاسی کرنے میں ماہر ہیں فردوسی کا "شاہنامہ" ایک ادبی شاہکار ہے جس کا ترجمہ دنیا کی بہت سی زبانوں میں کیا جاچکا ہے۔

سعدیؒ:۔ شیخ سعدیؒ کو کون نہیں جانتا "گلستاں" اور "بوستاں" ان کی شہرۂ آفاق کتابیں ہیں جو فارسی زبان میں ہیں یہ کتابیں آج بھی ہندوستان اور دیگر ممالک کے

مدارس میں شاملِ نصاب ہیں۔ ان کا کلام پند و نصائح اور اخلاقی شاعری سے بھرپور ہے جو قیامت تک خراجِ تحسین حاصل کرتا رہے گا۔

۳۳۔ خیبر

مدینہ سے دو سو میل کی دوری پر "خیبر" ایک بستی کا نام۔ جہاں یہودیوں کا دبدبہ تھا یہاں یہودیوں کے چھ قلعے تھے۔ جب یہودیوں نے اسلام کی مخالفت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کا ارادہ کیا تو آپ نے خیبر کے قلعہ کو فتح کرنے کے لئے کئی بار فوجی دستے بھیجے مگر قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ آخر میں آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کو بھیجا انھوں نے بیس دن تک قلعہ کا محاصرہ کئے رکھا اور اپنی شجاعت و بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ دشمنوں کو منھ کی کھانی پڑی اور ۷ھ میں قلعہ فتح ہو گیا۔ اسی لئے حضرت علیؓ کو "فاتحِ خیبر" کہا جاتا ہے۔

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن (اقبال) اس زمانہ میں کوئی حیدرؓ کرار بھی ہے۔

۳۴۔ دارا

فارس کے ایک بادشاہ کا نام جس سے سکندر لڑا تھا۔ یوں بھی وہاں ہر بادشاہ کو "دارا" کہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اشارہ خداوند تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے اس لئے کہ "دارا" بمعنی "رکھنے والا"۔

پہلے خود دار تو مانندِ سکندر ہو لے
پھر جہاں میں ہوسِ شوکتِ دارائی کر (اقبال)

۳۵۔ دُلدُل: نام اس مادہ خچر کا جو سفید سیاہی مائل تھی اور سکندریہ کے حاکم نے بطور تحفہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دی تھی۔ بعد میں آپ نے حضرت علیؓ کو دیدی۔

۳۶۔ دجّال

لقب ایک بُرے اور جھوٹے کا جو قیامت کے قُرب میں پیدا ہو گا اور خدا پر

ایمان رکھنے والوں کو طرح طرح سے گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کے اس عمل کی مخالفت کریں گے۔

۳۷۔ ذوالقرنین (سکندر)

ایک زبردست اور قدیم بادشاہ کا لقب ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ شاید سکندر اعظم کا لقب ہوگا مگر اس میں اختلاف ہے۔ ذوالقرنین اس کا لقب اس لئے تھا کہ وہ دو گیسو رکھتا تھا (قرن بمعنی گیسو)۔ دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ دنیا کے دونوں سمتوں یعنی مشرق و مغرب کے دور دراز ملکوں میں پہنچا تھا، یا یہ کہ نور و ظلمت دونوں میں وہ داخل ہوا تھا۔ یہ سکندر اعظم سے بہت پہلے سام بن نوحؑ کی نسل سے تھا۔ خضرؑ اس کے مشیر تھے اس نے یاجوج ماجوج کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لئے لوہے کی دیوار بنوائی جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے۔

۳۸۔ ذوالفقار

حضرت علیؓ کی تلوار کا نام۔ (فقار بمعنی ریڑھ کی ہڈی کی گریاں) چونکہ حضرت علیؓ کی تلوار کی پیٹھ برابر نہ تھی بلکہ اونچی نیچی تھی اس سبب سے "ذوالفقار" نام رکھا گیا

۳۹۔ ذوالنون:۔ (نون "بمعنی مچھلی) چونکہ حضرت یونس علیہ السلام سات روز تک مچھلی کے پیٹ میں رہے اس لئے ان کا لقب "ذوالنون" ہے۔

۴۰۔ رستم اور سام

یہ دونوں ایران کے مشہور پہلوان تھے سام، رستم پہلوان کے دادا اور زال کے باپ کا نام تھا۔ ؎

نہ رستم نہ سام باقی ہے
اک فقط نام ہی نام باقی ہے (مرزا شوق)

۴۱۔ روح الامین یا روح القدس:۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام۔

۴۲۔ روح اللہ:۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب۔

۴۳۔ رومیؒ

(۱۲۰۷ء تا ۱۲۷۲ء) رومیؒ ایک صوفی شاعر تھے ان کا پورا نام جلال الدین تھا۔ آپ بلخ میں پیدا ہوئے مگر روم میں سکونت اختیار کی اس لئے "رومی" کہلائے۔ رومی کی شاعری صوفیانہ خیالات سے پُر ہے ان کا ادبی شاہکار "مثنوی" ہے۔ یہ اپنی مثنویوں کی وجہ سے مشہور ہیں جن میں تصوّف کے مسائل کو حکایات اور نصیحت آمیز واقعات کے ذریعہ حل کیا ہے۔ سہ

گستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک (اقبالؔ) کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک

۴۴۔ زرتشت

زرتُشت ایران کا رہنے والا وہ شخص ہے جو آتش پرستی کا بانی کہلاتا ہے۔ آتش پرست اس کو اپنا پیغمبر مانتے ہیں۔

۴۵۔ سلجوق:۔ ترک نسل کا ایک مشہور خاندان جس نے ایران پر بہت دنوں تک بادشاہت کی۔ اس خاندان کے بانی کا نام سلجوق تھا۔

۴۶۔ سقراط:۔ یونان کا ایک حکیم جو افلاطون کا استاد تھا۔

۴۷۔ سومنات:۔ یہ عالم، یہ بُتخانۂ شش جہت

اسی نے تراشا ہے یہ سومنات (اقبالؔ)

"سومنات" ریاست جوناگڑھ (گجرات) میں ایک شہر کا نام ہے۔ سومنات کے ایک مشہور مندر میں چاند دیوتا کا ایک قوی ہیکل بت رکھا تھا جس کے لئے ہندو عقیدت مند سونے چاندی کی نذریں پیش کرتے تھے۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر کئی حملے کئے۔ ایک حملے میں جب اس نے اس مندر کے بڑے بت کو توڑنا چاہا تو وہاں کے پجاریوں نے اس بت کو نہ توڑنے کے عوض میں محمود غزنوی کو منھ مانگی رقم پیش کرنی چاہی مگر اس

نے کہا کہ میں قیامت کے دن بت فروش کے بجائے بت شکن کہلانا زیادہ پسند کروں گا۔ چنانچہ جب اس نے بڑے بت کو توڑا تو اس میں سے سیکڑوں من سونا چاندی اور ہیرے جواہرات نکلے جسے وہ سمیٹ کر اپنے وطن لے گیا۔

۴۸۔ سکندرِ اعظم (۳۵۶ - ۳۲۳ ق م)

روم کے ایک بڑے بادشاہ کا نام جس نے دنیا کے بہت سے ممالک فتح کئے ہندوستان میں پورس بادشاہ سے بھی اس کی جنگ ہوئی تھی۔

اپنے والد فلپ دوم کے قتل کے بعد مقدونیہ (روم) کے تخت پر بیٹھے۔
تحقیق سے یہ معلوم ہوا ہے کہ سکندر ذوالقرنین جس کی ملاقات خضر علیہ السلام سے ہوئی تھی وہ دوسرا تھا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو قیصری کیا ہے (اقبالؔ)

۴۹۔ شعیب علیہ السلام

حضرت شعیبؑ ایک پیغمبر تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے آپ ہی کے یہاں جا کر پناہ لی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی لڑکی کی شادی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کر دی۔ مہر کی ادائیگی کی رقم کو نہ ادا کر سکنے کی صورت میں آپ نے حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریوں کو بارہ سال تک چرانے کی شرط منظور کر لی۔ بارہ سال کی مدت پوری ہو جانے کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کے ساتھ گھر لوٹ رہے تھے تو دور جنگل میں آگ نظر آئی جسے لینے کے لئے وہ گئے۔ دراصل وہ آگ نہ تھی بلکہ جلوۂ الٰہی تھا۔ وہیں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر ہونے کی خوشخبری اللہ کی طرف سے ملی۔

اگر کوئی شعیب آئے میسّر ۔ شبانی سے کلیمی دو قدم ہے (اقبالؔ)

۵۰۔ شمر:۔ یزید کی فوج کا ایک حاکم جس نے محرم کی دسویں تاریخ کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ اسی لئے اس کو شمر ملعون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

۵۱۔ عرشِ سبائی

ملکہ بلقیس کے تخت کا نام ہے جو کہ شہر "سبا" (ملک یمن) میں تھا۔ اس تخت کو آصف بن برخیا وزیر حضرت سلیمان علیہ السلام نے چشم زدن میں مع ملکۂ بلقیس کے حاضر کر دیا تھا چونکہ جنات اور پرندے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ماتحت تھے اس لئے ہُدہُد نامی پرندے نے ملکہ بلقیس کے بارے میں خبر دی تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے حاضر کرنے کے بعد وہ ایمان لے آئی۔

۵۲۔ عزازیل

حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے یہ اللہ کا ایک مقرب فرشتہ تھا مگر اللہ کے حکم کی نافرمانی کرتے ہوئے جب اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کیا اور حضرت آدمؑ کے مقابلہ میں اپنے کو اعلا و افضل بتاتے ہوئے تکبر بھرے کلمات استعمال کئے تو خداوند قدوس نے اسے بطور سزا عرش سے فرش (دنیا) پر بھیج دیا اور ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ قرار دیا۔ جب ہی سے عزازیل نامی فرشتہ "ابلیس" یا "شیطان" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لئے اللہ کے نیک بندوں کو وہ قیامت تک گمراہی و بدکاری کی طرف راغب کرتا رہے گا، کیونکہ وہ سوچتا ہے کہ میں تو جہنمی ہوں ہی آدم کی اولاد کو بھی کیوں نہ جہنمی بناؤں جسے اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔

شعر
تکبر عزازیل را خوار کرد　　　به زندانِ لعنت گرفتار کرد

۵۳۔ فرعون

مصر کے قدیم بادشاہوں کا لقب رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ

ہیں مصر کے ایک بادشاہ کا نام بھی تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین کی سخت مخالفت کی تھی اور خود کو خدا کہلواتا تھا۔ ؎

فرعون نے کیا تھا جو دعوا خدائی کا — شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا — یہ بات ہے سمجھنے کی، آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — (نظیر اکبر آبادی)

۵۴۔ فغفور

چین کے ایک بادشاہ کا نام تھا۔ اس کے علاوہ چین کے قدیم بادشاہوں کا لقب بھی ہے۔ ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی، کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

۵۵۔ قیصر:۔

شاہانِ روم کا لقب ہے۔ ؎

تھے جو مشہور قیصر و فغفور — باقی ان کا نہیں نشانِ قبور (مرزا شوق)

۵۶۔ قومِ ثمود

ثمود حضرت نوح علیہ السلام کی چوتھی پشت کے ایک شخص کا نام۔ اسی کے نام پر قوم ثمود کہلائی۔ اس قوم کی اصلاح کے لئے اللہ نے حضرت صالح علیہ السلام کو بھیجا۔ لیکن یہ قوم راہ راست پر نہ آئی اور اپنی بداعمالیوں و نافرمانیوں کی وجہ سے عتابِ الٰہی کا شکار ہوئی۔

۵۷۔ کنعان

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کا نام ہے جس نے کفر اختیار کر لیا تھا۔ نمرود کے باپ کا بھی نام کنعان تھا۔ اس کے علاوہ ایک ملک کا بھی نام ہے جسے اب فلسطین

کہتے ہیں یہی حضرت یوسفؑ کے آبا و اجداد یعنی حضرت یعقوب بن اسحاق بن ابراہیمؑ کا مسکن تھا۔ ؎

نہ رہتی یوسفِ کنعاں کی خوبیٔ بازار (ذوقؔ) مقابلے میں جو ہم تجھ کو روبرو کرتے

۵۸۔ کہکشاں

آسمان پر شمال سے جنوب تک گھنے تاروں کی وہ سڑک ہے جو رات میں نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس راہ سے کوئی گھاس گھسیٹتا ہوا چلا گیا ہے اور اس کے نشان پڑ گئے ہیں۔ درحقیقت اس کا نام "کاہ کشاں" ہے دراصل جسے کہکشاں کہا جانے لگا۔ کہکشاں چھوٹے چھوٹے ستاروں کا ہجوم ہے جو بہت دور ہونے کے سبب دھندلے اور ذرّے کی طرح نظر آتے ہیں۔ ؎

حُقّہ جو ہے حضورِ معلّےٰ کے ہاتھ میں - گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

۵۹۔ کسریٰ:۔ ایران (فارس) کے بادشاہوں کا لقب تھا۔

۶۰۔ کیقباد:۔ عجم کے (ایران) ایک مشہور بادشاہ کا نام جو بہت عیّاش تھا۔ اس نے سَو سال تک حکومت کی۔

۶۱۔ کوثر و تسنیم

جنّت کی دو نہروں کے نام ہیں۔ ان کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا جسے جنتی پی کر خوش ہوں گے۔

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی (اقبالؔ)

۶۲۔ لات و منات

"لات" اور "منات" عرب کے دو بڑے بتوں کے نام ہیں۔ "لات" کو حضرت شعیبؑ

کی قوم پوجتی تھی اور دوسرے بت "منات" کو قبیلہ ہُذیل کے لوگ پوجتے تھے۔ حضرت محمدؐ کے آنے کے بعد ان بتوں کی پرستش ختم ہو گئی۔ ؎

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات (اقبالؔ)

۶۳۔ مسیح علیہ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے عربی میں مسیح کے معنی پاک اور بابرکت کے ہیں۔ قرآن میں بھی مسیح ابن مریم آیا ہے۔ ؎

مرے جو موت کے عاشق کبھو بیاں کرتے (ذوقؔ) مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

۶۴۔ محمود و ایاز

محمود ملک غزنی کا بادشاہ تھا۔ اس نے ہندوستان پر سترہ بار حملے کیے۔ اس کا سولہواں حملہ سومنات پر تھا۔ ایاز اس کا محبوب غلام اور مشیرِ خاص تھا۔ جس کو محمود غزنوی بہت مانتا تھا۔ ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز — قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے (اقبالؔ)

۶۵۔ نوشیرواں

نوشیراں فارس کا ایک عادل اور خوش خو بادشاہ تھا۔ چونکہ اپنے عدل و انصاف کے لئے یہ بہت مشہور تھا اس لئے اس کو "نوشیرواں عادل" کہا جاتا ہے۔

۶۶۔ نل دمن

قدیم ہندوستانی قصوں میں راجا "نل" اور "دمنی" کے عشق کا قصہ بہت مشہور ہے۔ یہ قصہ اردو کی داستان "کلیلہ و دمنہ" میں تفصیل سے درج ہے۔ ؎

ہے نہ شیریں، نہ کوہکن کا پتا
نہ کسی جا ہے، نل دمن کا پتا (مثنوی "زہر عشق" مرزا شوق)

۶۷۔ نخلِ مریمؑ

وہ سوکھا ہوا کھجور کا درخت جس کے نیچے حضرت مریم علیہا السلام حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے وقت جا پڑی تھیں۔ ان کی برکت سے وہ درخت سرسبز و شاداب ہوگیا تھا اور ہلانے سے تر و تازہ کھجوریں گرتی تھیں۔

۶۸۔ ہلاکو

اصل نام ہولاکو خاں ہے۔ وہ ایک ظالم اور سنگ دل بادشاہ تھا اس نے ہزاروں افراد کو بے قصور قتل کیا۔ اس کے باپ کا نام تولیخاں اور دادا کا نام چنگیز خاں تھا۔ ایران فتح کرنے کے بعد بغداد کا رخ کیا وہاں عسکری فوجوں کو شکست دینے کے بعد کئی روز تک قتل عام اور لوٹ مار کرتا رہا۔ اس میں لاکھوں افراد قتل ہوئے۔

۶۹۔ ہما

نام ایک پرندہ کا جو فقط ہڈّی کھاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو شخص اس کے سایہ کے نیچے آجاتا ہے دولت اور سلطنت پاتا ہے۔

۷۰۔ یاجوج وماجوج

یافث بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے یہ قوم ہے جسے "تاتاری" بھی کہتے ہیں

یہ قوم بڑی تعداد میں اور نہایت زبردست مثل دیو کے تھی۔ یہ چین کے شمالی کوہستانی حصّہ میں رہتے تھے۔ وہاں سے نکل کر جنوبی حصّہ کے لوگوں کو نہایت ایذا پہنچاتے اور لوٹ مار کر چلے جاتے۔ ذوالقرنین نے ان کے آنے کی راہ میں ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ تک پگھلے ہوئے سیسہ سے ایک مستحکم دیوار بنوادی، جس سے قوم یاجوج و ماجوج کے آنے کا راستہ بند ہوگیا۔ قرآن پاک میں یاجوج ماجوج کے حملوں سے بچنے کے لئے جس دیوار کے سلسلے کا ذکر کیا گیا ہے اس کو اسی بادشاہ نے بنوائی تھی جس کا لقب "ذوالقرنین" تھا۔

۱۷۔ یزداں

خدا کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ مجوسی (آتش پرست) قبل اسلام دو خداؤں کو مانتے تھے ایک "یزداں" اس کو فاعل خیر کا اور دوسرا "اہرمن" جس کو فاعل شر کا مانتے تھے۔ یعنی "یزداں" کو نیکی کا اور "اہرمن" کو بدی کا خدا تسلیم کرتے تھے۔

شہر قیصر کا جو تھا اس کو کیا سر کس نے؟ — تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا درِ خیبر کس نے؟

کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے؟ — توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟

کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو؟

کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟ ("شکوہ"۔ اقبالؔ)

اردو زبان کی مختصر تاریخ

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اردو ایک نئی زبان ہے جس کی عمر تقریباً ایک ہزار سال ہے یہ اصل میں برج بھاشا سے نکلی ہے جو دہلی اور متھرا کے قرب وجوار میں بولی جاتی تھی۔ اردو میں عربی، فارسی، برج بھاشا، کھڑی بولی، پنجابی، ترکی، انگریزی اور پرتگالی زبان کے الفاظ شامل ہیں۔

۱۰۰۰ء میں مسلمان شمال کے راستے ہندوستان آئے اور دہلی کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ یہاں کے مقامی لوگوں کی زبان "برج بھاشا" کا اثر انھوں نے سب سے زیادہ قبول کیا اور یہاں کی زبان میں بھی ان کی زبانوں یعنی عربی، فارسی، اور ترکی کے الفاظ شامل ہوئے۔ اس کے علاوہ شاہجہاں بادشاہ نے جب آگرہ کے بجائے دہلی کو دارالسلطنت، بنایا اور شہر و قلعہ میں مختلف زبانوں کے بولنے والے ایک ساتھ رہنے سہنے لگے تو ایک نئی زبان نے جنم لیا جسے "اردو زبان" کہا گیا۔

اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنیٰ ہیں "لشکر"۔ شروع میں اردو زبان صرف چھاؤنیوں تک محدود تھی کیونکہ درباریوں اور پڑھے لکھے لوگوں کی زبان فارسی تھی لیکن اردو زبان کی مٹھاس نے آہستہ آہستہ اسے اتنا مقبول بنا دیا کہ پورے ہندوستان کی محبوب زبان بن گئی۔ یوں تو ہندوستان میں محمود غزنوی کے آنے کے بعد یعنی آج سے تقریباً ایک ہزار سال قبل اردو زبان کی ابتداء ہو چکی تھی لیکن شاہجہاں کے عہد (۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۸ء) میں یہ زبان اپنی حقیقت منوانے کے قابل ہوئی۔ سلاطینِ وقت کی سرپرستی پا کر یہ زبان تیز رفتاری کے ساتھ ارتقائی منزلیں طے کرنے لگی۔ شاہجہاں نے اس کا نام "اردوئے معلیٰ" رکھا۔ اس کے علاوہ اردو کو مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے پکارا گیا

مثلاً ہندی، ہندوی اور ریختہ۔

شروع شروع میں اس زبان کا استعمال صرف تجارتی حلقہ تک تھا۔ خط و کتابت، دفتری کاموں اور شعر و شاعری میں اردو زبان رائج نہ تھی لیکن جب شمالی ہندوستان کے لوگ کاروبار کے خیال سے دکن گئے اور محمد شاہ تغلق نے اپنی راجدھانی دہلی کے بجائے دیوگری (دکن) منتقل کی تو اس کے حکم سے لاکھوں افراد شمالی ہند سے دکن پہنچے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند کی وہی زبان جو صرف بول چال تک محدود تھی، دکن کی مشہور ریاستوں مثلاً بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ کے حکمرانوں کا سہارا پا کر رفتہ رفتہ ادبی حیثیت اختیار کرنے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ نظم و نثر کی ابتدائی نمونے ہمیں دکن میں پہلے ملتے ہیں۔ اگرچہ اس سے قبل شمالی ہندوستان میں امیر خسرو کی مشہور تصنیف "خالق باری" ہے جس میں عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے مترادف یعنی ہم معنی الفاظ کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے جیسے ؎

بیا برادر آؤ رے بھائی

بنشیں مادر بیٹھ رے مائی

اگرچہ امیر خسرو سے اردو شاعری کی ابتداء ہو جاتی ہے لیکن اردو زبان کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر جدید تحقیق کے مطابق سلطان محمد قلی قطب شاہ کو مانا گیا ہے۔ حالانکہ ایک عرصہ تک ولی دکنی کو اردو زبان کا پہلا شاعر اور "باوا آدم" کہا گیا۔ جہاں تک نثر کا تعلق ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نثر کا آغاز سب سے پہلے شمالی ہندوستان میں ہوا اور اس کے جواز میں خواجہ سیّد گیسو دراز بندہ نواز کی تصنیف "معراج العاشقین" کا حوالہ دیا جاتا ہے لیکن اردو زبان کی تاریخ سے اس کا کوئی مستند ثبوت نہیں ملتا۔ اس سے قطع نظر اگر "معراج العاشقین" کو کچھ دیر کے لئے اردو نثر کی پہلی کتاب تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی یہ اردو نثر کی پہلی کتاب نہیں ہے اس لئے کہ "معراج العاشقین" ایک مذہبی رسالہ ہے۔ جس میں گیسو دراز کے ملفوظات ہیں۔

اردو نثر کا پہلا نمونہ "سب رس" ہے ۱۶۳۵ء میں ملا وجہی نے تصنیف کیا۔ ملا وجہی سلطان قلی قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ یہ کہنا درست ہے کہ اردو کا جنم شمالی ہند میں ہوا مگر

اس کی نشوونما دکن میں ہوئی اور پھر اسی سرزمین میں پہنچ کر شباب حاصل ہوا جہاں اس نے جنم لیا تھا یعنی شمالی ہندوستان۔

اورنگ زیب کے عہد میں ولیؔ دکنی کے دہلی آنے اور ان کے اردو کلام سے متاثر ہونے کے نتیجہ میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ولیؔ کے اردو کلام کو سن کر فارسی گو شعراء پھڑک اٹھے اور اس بات کے قائل ہو گئے کہ اردو میں شعر و شاعری کی بہت گنجائش ہے انھوں نے محسوس کیا کہ اردو کی تنگ دامانی کا شکوہ ہماری خام خیالی تھی۔ ولیؔ کے کلام نے شمالی ہند میں لوگوں کو اردو شاعری کی طرف راغب کر دیا جس کے نتیجہ میں اس دور کے اردو شعراء میں خاص طور پر خاں آرزوؔ، مظہر جانِ جاناں، شاہ حاتمؔ یکرنگ اور شاکر ناجیؔ بہت مشہور ہیں۔ ان شعراء کے ذریعہ دہلی میں اردو شاعری کا نہ صرف آغاز ہوا بلکہ "ریختہ" میں شعر کہنے کا چلن عام ہونے لگا۔ اس دور کو "دبستان دلی" کی شاعری کا پہلا دور کہا گیا ہے۔ دبستانِ دلیؔ کے دوسرے دور میں شاہ حاتمؔ (جنھوں نے طویل عمر پائی تھی) مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کے پیش رو میر تقی میرؔ۔ خواجہ میر دردؔ۔ اور مرزا محمد رفیع سوداؔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دہلی شاعری کے اس دوسرے دور کی بنیادی خصوصیت ایہام گوئی ہے۔

اس دور میں مرزا مظہر جانِ جاناں کی تحریک "اصلاحِ زبان" خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے جس نے ایہام گوئی کے خلاف ایک منظم تحریک چلائی اور زبان کو صاف کرنے کی کوشش کی۔

اردو شاعری کا تیسرا دور جسے "عہد زریں" کہا جاتا ہے، میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کا مرہون منت ہے کیونکہ اس دور میں اردو شاعری اپنے معراج پر پہنچی ہوئی تھی بد قسمتی سے شاہ عالم کے اس دور میں دہلی پر پے در پے تباہیاں آئیں۔ دہلی کے شعراء نے پریشان ہو کر رفتہ رفتہ لکھنؤ کا رخ کیا جہاں نوابینِ اودھ کی علم دوستی اور ادب نوازی کا ڈنکا بج رہا تھا۔ وہاں امن و سکون کے ماحول کے ساتھ ساتھ انھیں قدر و منزلت بھی نصیب ہوئی۔ دہلی کے بلند پایہ شعراء کی محفلیں درہم برہم ہو گئیں تھیں۔ لکھنؤ میں

شعر و شاعری کو عروج ملا۔ نواب آصف الدولہ کے عہد سے لے کر، غازی الدین حیدر کے زمانہ تک شعرا اردو کو نوابانِ اودھ کی سرپرستی حاصل رہی۔ اردو زبان کی ترقی کے لئے دہلی کے بعد دوسرا مرکز لکھنؤ بنا۔ اسی لئے اس دور کی شاعری کو چند خصوصیات کے باعث "دبستان لکھنؤ" کی شاعری کہتے ہیں۔ "لکھنؤ اسکول" کے مشہور شعرا میں مصحفیؔ، انشاؔ، جرأتؔ، آتشؔ، ناسخؔ، انیسؔ، دبیرؔ اور امانتؔ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

"لکھنؤ اسکول" دہلی کی تباہی و بربادی کے نتیجہ میں ظہور میں آیا لیکن جیسے ہی دہلی میں امن و امان ہوا اس نے اپنی مرکزیت کو دوبارہ حاصل کرلیا اور یہیں سے اردو شاعری کا ایک روشن دور شروع ہوا۔ یہ دور مومنؔ۔ ذوقؔ۔ غالبؔ اور ظفرؔ جیسے بلند پایہ شعرا کا دور تھا جن کی شاعری پر آج زبانِ اردو کو ناز ہے۔ انھیں کی روش پر آگے چل کر داغؔ۔ اقبالؔ، جگرؔ، حسرتؔ۔ فانیؔ۔ فراقؔ۔ فیضؔ اور بہت سے دیگر شعرا نے اردو شاعری کو اپنے کلام سے آراستہ کیا۔

۱۸۵۷ء سے پہلے کی نظم و نثر قدیم نظم و نثر کہلاتی ہے۔ قدیم نثر تصنع اور مقفیٰ و مسجع عبارت سے پر ہے۔ شعر و شاعری زندگی کے حقائق سے دور صرف حسن و عشق اور گل و بلبل کے ذکر سے معمور ہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی تو انقلاب زمانہ اور انگریزی ادب کے اثر سے اردو نظم و نثر میں زبردست تبدیلی آئی۔ دیومالائی داستانوں، عشقیہ شاعری اور مقفیٰ و مسجع عبارتوں سے ہٹ کر نئے قسم کی شاعری اور نثر نگاری کا آغاز ہوا جس کو ہم "جدید نظم" اور "جدید نثر" کی ابتدا کہتے ہیں۔ "ادب برائے ادب" کے بجائے "ادب برائے زندگی" کا رجحان پیدا ہوا۔ اردو میں جدید نظم کی بنیاد محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے رکھی۔ اسی طرح جدید نثر کی بنیاد مرزا غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعہ رکھی۔ جس کو اردو کے عناصر خمسہ سرسید احمد خاں۔ الطاف حسین حالی۔ محمد حسین آزاد۔ ڈپٹی نذیر احمد اور شبلی نعمانی نے بام عروج پر پہنچایا۔ ان کے بعد نثر کے اس سلسلے کو مختلف نثری اصناف کے ذریعہ آگے بڑھانے میں مرزا فرحت اللہ بیگ، مہدی افادی، پطرس بخاری، پریم چند، مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، مولانا عبدالماجد دریابادی، کرشن چندر، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، احتشام حسین اور مسعود حسین رضوی ادیب

وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اردو کو عام فہم بنانے اور فروغ دینے میں انگریزوں کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ انگریزوں کو دفتری اور کاروباری کاموں کے لئے اردو زبان سے واقفیت ضروری تھی چنانچہ اس مقصد کے لئے ۱۸۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی۔ اس ادارہ کے ذریعہ اردو زبان کو بہت فروغ ملا۔ رفتہ رفتہ اردو زبان میں اتنی صلاحیت اور وسعت پیدا ہوگئی کہ ہر طرح کے مضامین، خیالات اور علومِ جدید واضح طور پر بیان کئے جانے لگے۔ موجودہ اردو زبان تقریباً ایک ہزار سال کا طویل سفر طے کر کے ہم تک اس صورت میں پہنچی ہے۔ اردو زبان کا سرسبز و شاداب چمن جو دلکشی و جاذبیت سے معمور ہے چند لوگوں کی کوششوں کا ثمرہ نہیں بلکہ ہر قوم و ملت کے اہلِ فہم نے اس کی آبیاری کی ہے۔ یہ گنگا جمنی زبان کسی ایک مذہب، کسی ایک زبان یا کسی ایک طبقہ کی تنہا مرہونِ منت نہیں بلکہ اس ہر دلعزیز زبان کی نشوونما میں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی سب ہی کا ہاتھ ہے تقسیم ہند کے بعد سے کچھ متعصب افراد اردو کو غیر ملکی یا صرف مسلمانوں کی زبان کہنے لگے ہیں۔ شاید انھیں معلوم نہیں کہ اردو زبان کے بہت سے بلند پایہ شعراء اور نثار مثلاً دیاشنکر نسیم پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ ہرگوپال تفتہ۔ منشی پریم چند۔ جوش ملسیانی۔ فراق گورکھپوری۔ برج نرائن چکبست۔ ہری چند اختر۔ راجندر سنگھ بیدی۔ کرشن چندر اور راجہ نرندر ناتھ وغیرہ مسلمان نہیں تھے۔ ان لوگوں کی بھول اور تنگ نظری ہے جو اردو زبان کو غیر ملکی یا مسلمانوں کی زبان بتا کر اس کی جنم بھومی بھارت سے اس کا رشتہ منقطع کر دینا چاہتے ہیں۔ برج بھاشا کی بیٹی اردو کی بدنصیبی ہے کہ ہر خاص و عام کی محبوب اور پسندیدہ زبان ہونے کے باوجود آج تعصب کا شکار ہے۔ حکمراں طبقہ نے اس زبان کو اس کے جائز حقوق کے دلوانے میں کوئی واضح پالیسی اختیار نہیں کی۔ ہمیں سوچنا چاہئے کہ اردو زبان ہندو مسلم دونوں کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ یہ خالص ہندوستان کی زبان ہے اس نے یہیں جنم لیا اور یہیں پروان چڑھی۔ اس زبان میں ایک طرف جہاں حسن و عشق کی چاشنی اور گل و بلبل کی داستانیں ہیں وہاں دوسری طرف "انقلاب زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے

اور میدانِ کارزار میں چمکنے والی تلواروں کی جھنکاریں بھی ہیں۔ پھر ایسی ہر دلعزیز زبان کے لئے جوشؔ کا یہ کہنا بہت حد تک مناسب ہے :۔

ے احمدِ پاک کی خاطر تھا خدا کو منظور — ورنہ قرآں بھی اترتا بزبانِ اردو

بہرحال اردو دشمن عناصر کی ہزار مخالفتوں کے باوجود اردو زبان اپنی خصوصیات کے باعث ہمیں اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ :۔

ع "پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔"

فورٹ ولیم کالج

مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزوں کی آمد کا نہ صرف ہندوستان کی سیاست بلکہ ادب پر بھی گہرا اثر پڑا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل اردو زبان عربی و فارسی الفاظ مسجع اور پُرتکلف عبارت سے پُر تھی۔ مغربی ادب اور تہذیب کا اثر تیزی سے ہندوستانیوں پر پڑ رہا تھا اور اردو داں طبقہ دھیرے دھیرے آسان پسندی کی طرف راغب ہو رہا تھا چنانچہ ۱۸۵۰ء کے آس پاس مرزا غالبؔ نے آسان اردو میں خطوط لکھنے کا جو سلسلہ شروع کیا وہ بہت مقبول ہوا۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اردو کو سہل اور بامقصد بنانے کا اولین سہرا مرزا غالبؔ کے سر ہے۔

دوسری طرف انگریزوں کا نظریہ ہندوستان میں صرف تجارت ہی کرنا نہیں تھا بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور وہ پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ چنانچہ ہندوستان کے کئی صوبوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ انگریز حکام کو اردو زبان سے واقف ہونا چاہئے تاکہ وہ ہندوستانیوں سے حکومت کا کام لے سکیں اور اردو زبان کے توسل سے زیادہ سے زیادہ ان کے قریب ہو سکیں۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اردو زبان میں آسان کتابوں کی سخت ضرورت

تھی تاکہ انگریز حکام اردو سیکھ سکیں۔ چنانچہ ۱۸۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ اس کا مقصد اردو کو زیادہ سے زیادہ آسان بنا کر کمپنی کے ملازمین کو اردو سکھانا تھا اس لئے ملک کے مشہور مصنفین کو اس کالج میں مقرر کیا گیا تاکہ وہ مختلف زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ آسان اردو میں کر سکیں۔ فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل جان گل کرائسٹ تھے۔ چونکہ وہ اردو زبان سے بخوبی واقف تھے اس لئے انھوں نے اس ادارے کے منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے اردو کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے اردو کی لغت اور قواعد کی کتابیں بھی مرتب کیں۔ جان گل کرائسٹ نے ہندوستان کے ممتاز اہلِ قلم اور انشاپردازوں کو جمع کر کے ان سے تصنیف و تالیف اور تراجم کا کام لیا۔ میر امّن دہلوی کی مشہور کتاب "باغ و بہار" جو ایک فارسی کتاب "قصہ چہار درویش" کا ترجمہ ہے یہیں تیار ہوئی۔

اس کالج کے قیام سے اردو کی ترقی پر بہت خوشگوار اثر پڑا۔ فورٹ ولیم کالج کی خدمات اردو ادب کی تاریخ میں اہم مقام رکھتی ہیں کیونکہ اس کالج کی کوششوں سے اردو میں بہت جلد یہ صلاحیتیں پیدا ہو گئیں کہ وہ فارسی کی جگہ سرکاری زبان کا درجہ اختیار کر لے۔ چنانچہ ۱۸۳۲ء میں فارسی کے بجائے اردو سرکاری زبان قرار پائی۔

اس کالج کے مشہور مصنفین حسب ذیل ہیں جنھوں نے اردو میں بہت سی آسان کتابیں لکھیں اور مختلف زبانوں سے اردو میں ترجمہ کیا۔

(۱) میر امّن دہلوی (باغ و بہار) (۲) شیر علی افسوس (اردو ترجمہ گلستاں سعدی)۔ (آرائش محفل) (۳) سید حیدر بخش حیدری (مثنوی لیلیٰ مجنوں۔ تذکرۂ گلشنِ ہند) (۴) میر بہادر علی حسینی (اخلاقِ ہندی) (۵) مرزا کاظم علی (ترجمہ تاریخ فرشتہ)۔ (سنگھاسن بتیسی وغیرہ) (۶) نہال چند لاہوری (گل بکاؤلی) (۷) للولال جی (بتیال پچیسی۔ شکنتلا ناٹک) ان کے علاوہ قصہ حاتم طائی۔ طوطا کہانی اور طوطی نامہ وغیرہ کتابیں بھی یہیں تیار ہوئیں۔ فورٹ ولیم کالج نے کم و بیش بیس سال تک اردو زبان کی خدمات انجام دیں۔ اس عرصہ میں پندرہ مصنفین نے اردو کی پچاس کتابیں تصنیف و تالیف

اور ترجمہ کیں۔

فورٹ ولیم کالج صرف تصنیف وتالیف یا ترجمہ کا ہی کام نہیں انجام دیتا تھا بلکہ اس کے کئی شعبے تھے مثلاً تعلیم وتدریس، کتب خانہ اور پریس وغیرہ۔ اس کالج میں اردو کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت کی کتابیں لکھی گئیں اور ان زبانوں کی کتابوں سے اردو میں ترجمہ کا کام بھی ہوا۔

اگرچہ فورٹ ولیم کالج کا قیام خالص سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ عمل میں آیا تھا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ذریعہ اردو زبان کی جو ترقی شعوری یا غیر شعوری طور پر ہوئی اسے اردو زبان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

دبستانِ دلیؔ

دلی اور لکھنؤ پایہ تخت ہونے کی وجہ سے اردو زبان کے اہم مراکز تھے۔ یہاں کے شعرائے اپنے اپنے ماحول اور سیاسی حالات سے متاثر ہو کر مختلف اصناف اور انداز میں طبع آزمائی کی دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری اپنی ساخت، خصوصیات اور اصناف کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت سی باتوں میں مختلف ہے جسے ہم "دبستانِ دلیؔ" اور "دبستانِ لکھنؤ" کہتے ہیں اسے "دہلی اسکول" اور "لکھنؤ اسکول" بھی کہا جاتا ہے۔

دبستانِ دلیؔ اور اس کی خصوصیات

اورنگ زیب کے عہد میں ولی دکنی جب دہلی میں آئے تو یہاں کے فارسی گو شعراء نے بھی ان کے اردو کلام کو سن کر اردو میں شعر وشاعری شروع کر دی چنانچہ اٹھارویں صدی کے آغاز میں یعنی اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد جب محمد شاہ رنگیلا تخت نشین ہوا تو اس وقت تک دہلی شعر وشاعری کا مرکز بن چکی تھی۔ ہر طرف سے شعراء دہلی میں آ کر جمع ہو چکے تھے۔ امراء اور رؤسا بھی شعر وشاعری سے گہری دلچسپی لینے لگے تھے۔ جس کے نتیجہ میں بہت نامور شعراء دہلی میں پیدا ہوئے۔

دبستانِ دلی کے بلند پایہ شعراء میں میر۔ سودا۔ درد۔ میر حسن۔ غالب۔ مومن۔ ذوق اور داغ کے نام سرِفہرست ہیں۔ سودا نے اگر صنفِ قصیدہ کو معراج کمال تک پہنچایا تو درد نے صوفیانہ شاعری کو عروج بخشا۔ میر نے اپنی غزلوں اور مثنویوں سے انقلاب برپا کیا۔ یہ دور اردو شاعری کا "زریں عہد" کہلاتا ہے۔ دبستانِ دلی کے شعراء نے غزل، قصیدہ اور مثنوی کے میدان میں اپنی بھرپور صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ شعرائے دہلی کے کلام کی وہ کون سی خصوصیات ہیں جن کی بناپر اسے "دبستان دلی کا نام دیا گیا۔

دبستانِ دلی کی شاعری اس دور کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات سے متاثر ہوکر ایک الگ ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اردو زبان جب اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوئی تو اس وقت سلطنتِ مغلیہ کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ دہلی پر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور جاٹوں و مرہٹوں کی لوٹ مار سے ایک تباہی آچکی تھی۔ دھن دولت، جاہ وجلال اور زندگی کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ دنیا کی بے ثباتی کا تصور ہر خاص وعام کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ دہلی کے شعراء میں درد، طبیعت میں سادگی، صاف گوئی، ہمدردی اور سوز وگداز کا جذبہ پیدا ہوا جن کا اظہار ان کی شاعری میں بھی نظر آیا۔ اس کے علاوہ دہلی بزرگانِ دین کا مرکز رہا ہے جس کی وجہ سے یہاں کی شاعری میں تصوف وروحانیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ دبستانِ دلی کا ماحول دبستانِ لکھنؤ کے ماحول سے بالکل مختلف تھا چنانچہ اس ماحول کے اثر سے دہلی کی شاعری میں سادگی اور حقیقت بیانی کے ساتھ ساتھ آمد بھی ہے۔ تصوف اور عشق کے پاکیزہ خیالات کے اظہار کے لئے غزل کا میدان موافق تھا۔ چنانچہ دہلی اسکول میں صنفِ غزل پر زیادہ زور دیا گیا۔ کلام میں فطری جذبات کے ساتھ یہاں کی بربادی اور تباہی کے اثرات سے یاسیت اور محرومی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ دنیائے فانی اور اس کی بے ثباتی کا تصور یہاں کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ معاملاتِ عشق میں حیا اور پردہ داری کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

لیکن ۱۷۹۶ء میں لکھنؤ کے نواب وزیر علی نے دلی کے دربار سے آزادی کیا حاصل کرلی کہ لکھنؤ والوں نے ہر شے میں خود کو آزاد کرلیا۔ تہذیب وتمدن، آدابِ مجلس اور اندازِ شعر وشاعری

وغیرہ میں ایک نئی راہ اختیار کی۔ دہلی کی شاعری میں جہاں سادگی و برجستگی اور جذباتی و داخلی رنگ ہے تو اس کے برعکس لکھنؤ کی شاعری میں تکلف و تصنع اور لفظی و خارجی رنگ پایا جاتا ہے۔

دبستانِ لکھنؤ

اٹھارویں صدی کے آخیر میں دلی پر طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہونے لگی تھیں۔ مرہٹے سکھ، جاٹ اور روہیلے گاہے گاہے دلی پر حملے کرتے رہے۔ باہر سے نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے دلی کو تباہ کر دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی آہستہ آہستہ زور پکڑتی جا رہی تھی۔ ان سب وجوہات نے مغل سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں اور ملک کے اندر نئی نئی ریاستیں اور حکومتیں قائم ہونے لگیں ان میں ایک "اودھ" کی حکومت بھی تھی۔ اس حکومت کے پہلے حاکم نواب شجاع الدولہ تھے انھوں نے دہلی سے شاعروں، کاریگروں اور دوسرے ماہرین کو بلا کر اپنے دربار کی رونق بڑھائی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مرزا رفیع سودا کو بھی خط لکھ کر دہلی سے بلایا تھا۔ پہلے تو انھوں نے انکار کر دیا مگر کچھ دنوں بعد حالات سے تنگ آکر لکھنؤ آگئے۔ اسی طرح میر انیس کے پر دادا میر ضاحک۔ میر تقی میر۔ سوز۔ خاں آرزو انشاء اللہ خاں انشاء وغیرہ بھی دہلی سے لکھنؤ گئے کیونکہ دہلی اور دہلی دربار کی تباہی کے بعد شعراء کرام کی نہ تو وہاں قدر و منزلت تھی اور نہ ان کی روزی روٹی کا کوئی ذریعہ۔

لکھنؤ کے پرسکون اور عیش و عشرت کے ماحول میں اٹھارویں صدی کے وسطی دور سے شعر و شاعری کا چرچا زور و شور سے شروع ہوا۔ نواب شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ اودھ کے حاکم ہوئے۔ انھوں نے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو دارالخلافہ بنایا چونکہ وہ خود بھی شاعر تھے۔ اور شعراء کی قدر کرتے تھے اس لئے دہلی کے مذکورہ شعراء کے علاوہ دوسرے شہروں کے بھی بہت سے شاعر لکھنؤ آئے۔ مثلاً مصحفی۔ جرأت۔ اور نسیم وغیرہ۔ جب یہ شعراء لکھنؤ پہنچے تو یہاں کی دنیا دہلی سے مختلف نظر آئی۔ یہاں نئی حکومت کی نئی نئی امنگیں، عیش و عشرت، میلے ٹھیلے اور حسن و عشق کی گلکاریاں تھیں۔ خاص و عام سب اس رنگ میں ڈوبے

ہوئے تھے شعراء نے جب یہ رنگ دیکھا تو نوابوں کو خوش کرنے اور عوام سے اپنے کلام کی داد پانے کے لئے اپنی شاعری میں بھی وہی رنگ اختیار کیا یعنی شاعری میں چھیڑ چھاڑ، حسن و عشق کی داستانیں، محبوب کی سراپا نگاری اور حریفوں کی ہجو لکھی جانے لگیں۔ شاعری میں عریاں اور فحش نگاری کو پسند کیا جانے لگا۔ حسن و عشق، ہجر و وصال اور رقابت کا ذکر دبستانِ دہلی کی شاعری میں پہلے بھی تھا مگر لکھنؤ کے ماحول میں شاعری کے اندر بے باکی، بے شرمی اور بے حیائی آگئی۔ دبستانِ لکھنؤ کے مشہور شعرا میں مصحفی۔ ناسخ۔ رنگین۔ جرأت۔ آتش۔ مرزا شوق۔ انیس و دبیر اور انشا، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

لکھنؤ میں ایک خاص قسم کی شاعری بھی شروع ہوئی جسے "ریختی" کہتے ہیں۔ اس شاعری میں عورتوں کی زبان میں اشعار کہے جاتے تھے۔ جیسے :۔

اور مستانیاں وہ ہوتی ہیں
مردوں پر جو جان کھوتی ہیں (مرزا شوق)

ناسخ اور آتش کے زمانہ میں لکھنؤ اسکول کا نیا دور شروع ہوا۔ یہ دور لکھنؤ شاعری کا دورِ عروج تھا۔

مختصر یہ کہ جب دہلی کی بزم شعر و شاعری حوادث زمانہ کے باعث پھیکی پڑ گئی تو لکھنؤ میں ایک نئی بساط جمی اور تھوڑے ہی دنوں کے اندر وہاں کے در و دیوار سے شعر و شاعری کی آوازیں آنے لگیں۔ نوابانِ اودھ نے بھی ہر طرح سے ان شعرا کی مدد اور حوصلہ افزائی کی۔ دبستانِ لکھنؤ میں اگرچہ شعر و شاعری کے اندر فحاشی اور بے شرمی کا دخل ہو گیا تھا لیکن اس سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہاں زبانِ اردو کو کوئی فروغ یا ترقی نہیں ہوئی۔

صنفِ مرثیہ کے شہنشاہ انیس و دبیر دبستانِ لکھنؤ کے ہی شعرا ہیں جنھوں نے صنفِ مرثیہ کو معراجِ کمال پر پہنچا کر اردو ادب کو بہت کچھ بخشا۔ اِن کے علاوہ دیگر شعرائے لکھنؤ نے بھی زبان کی اصلاح کی۔ محاورات درست کئے، زبان کی نئی نئی بندشیں، تراکیب اور روزمرہ ایجاد کئے۔ رنگینی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان میں لطافت اور نزاکت بخشی۔ شعرائے لکھنؤ نے نئے نئے مضامین سے اردو شاعری کو آب و تاب بخشی۔ لکھنؤ میں نظم

ونثر کو فروغ ملنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اہلِ قلم کو نوابانِ اودھ کی بھرپور سرپرستی حاصل تھی۔ وہاں شعر و شاعری صرف امرا یا دربار تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ عوام بھی اس سے دلچسپی رکھتے تھے اس کا اثر یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں لکھنؤ کی شاعری کا اپنا ایک خاص انداز بن گیا جس کو ہم "دبستانِ لکھنؤ" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں جو "دبستانِ دلی" کے انداز شاعری سے چند باتوں میں مختلف ہے۔

دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ کا فرق

دونوں دبستانوں کا یہ فرق زیادہ تر زبان، انداز بیان، شعری اصناف، صنائع و بدائع اور خیالات و جذبات کے انتخاب میں ظاہر ہوتا ہے دونوں دبستانوں کی زبان میں کچھ الفاظ محاورات، تذکیر و تانیث اور سب سے بڑھ کر لب و لہجہ کا فرق ہے۔ لکھنؤ کے شعراء نے دلی کے شعراء کے مقابلے میں تشبیہات و استعارے کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ لکھنؤ میں زبان کی صحت پر کچھ زیادہ ہی زور دیا گیا ہے جس کی وجہ سے اعلیٰ اور صاف ستھرے خیالات کی طرف توجہ کم ہوئی بلکہ یہاں تک ہوا کہ معمولی، گندے اور بناوٹی کوائف کو بھی دلچسپ طریقے سے ادا کرنے کو فن شاعری سمجھا جانے لگا۔ اس کے نتیجہ میں لکھنؤ شاعری معنوی اور داخلی اعتبار سے بہت پھیکی ہو گئی۔ لکھنؤ شاعری میں جو رنگینی پیدا کی گئی وہ محض بناوٹی پھولوں کی طرح خوشنما تھی۔ یہ باتیں لکھنؤ اسکول کے تمام شعراء کے لئے نہیں کہی جا سکتیں مگر ہاں بیشتر شعراء اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اس لئے لکھنؤ کی شاعری پر انھیں کا رنگ غالب رہا۔

الغرض دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کا انداز بہت سی باتوں میں دبستانِ دلی کی شاعری سے مختلف ہے ایسا کیوں ہے؟ اس کا مختصراً جواب اوپر لکھا جا چکا ہے دونوں دبستانوں کے مذکورہ فرق سے ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ دبستانِ لکھنؤ نے اردو کے فروغ اور اس کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہیں لیا۔ دبستانِ لکھنؤ کی شاعری یقیناً ع۔ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے ماحول میں پھلی پھولی۔ دلی کے شعراء کو یہ ماحول بہت کم نصیب ہوا لیکن لکھنؤ اسکول نے اپنی ہزار رنگینیوں کے باوجود زبانِ اردو کو بے پناہ وسعت اور لطافت بخشی جسے اردو ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

"دہلی اسکول" کی شاعری میں دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے صنفِ غزل پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ لکھنؤ اسکول کی شاعری میں صنفِ غزل کے ساتھ ساتھ صنفِ مرثیہ اور مثنوی پر بھی کافی توجہ دی گئی۔ دبستانِ دلی کی شاعری میں زبان، محاوروں، تراکیبِ الفاظ اور تذکیر و تانیث کے باقاعدہ ضوابط متعیّن نہیں تھے جبکہ دبستانِ لکھنؤ کے شعراء نے اصلاحِ زبان کے سلسلہ میں ان باتوں پر زیادہ دھیان دیا خصوصاً ناسخ کا نام اس ضمن میں سرِفہرست ہے۔ دونوں دبستانوں کی زبان اور موضوعِ بیان کا اعتراف غالب نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:۔ "مضمون دلی اور زبان لکھنؤ کی خوب ہے"۔

دلی اور لکھنؤ اسکول کی شاعری کے فرق کو چند لفظوں یا کچھ شعری مثالوں کے ذریعہ ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں ان کے ذریعہ اندازِ فکر، اسلوبِ بیان اور بندشِ الفاظ وغیرہ کے جو نمایاں فرق ہیں ان کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس خیال کے تحت ذیل میں دونوں دبستانوں کے کچھ شعراء کے ایسے اشعار پیش کئے گئے ہیں جن کے ذریعہ ان کے اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان کے فرق کا کسی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے۔

دبستانِ دلی	دبستانِ لکھنؤ
۱۔ تیرے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا (غالب)	۱۔ جانے نہ دوں گا آپ کو سننے کا میں نہیں باتیں بنا کے وصل کا وعدہ نہ ٹال لے (امانت)
۲۔ سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوّری تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہئے (غالب)	۲۔ لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں (انشاء)
۳۔ گلستانِ جہاں کی دید کیجو چشمِ عبرت سے کہ ہر اک سرو قد ہے اس چمن میں نخلِ ماتم کا (درد)	۳۔ عشق اس ناف کا نہیں اچھا ڈوبتی ہے بھنور میں جا کر ناؤ (مصحفی)

۴۔ مزاجوں میں یاس آگئی ہے ہمارے
نہ مرنے کا غم ہے، نہ جینے کی شادی
(میر تقی میر)

۴۔ خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو
کہ ہر ایک گھر خانۂ دل شادی ہے ہر ایک کوچہ عشرت کا
(سحر لکھنوی)

۵۔ غافل تو کدھر بہکے ہے ٹک دل کی خبر لے
شیشہ جو بغل میں ہے اسی میں تو پری ہے
(درد)

۵۔ کسی کے محرمِ آبِ رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا
(آتش)

۶۔ تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
(مومن)

۶۔ نرگس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

۷۔ نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
(میر تقی میر)

۷۔ کیا نزاکت ہے جو توڑا شاخِ گل سے کوئی پھول
آتشِ گل سے پڑے چھالے تمہارے ہاتھ میں
(امیر مینائی)

اردو ادب میں "جدید نثر و نظم کا آغاز"

جدید نثر:۔ کہا جاتا ہے کہ اردو نثر کا آغاز نظم کے بعد ہوا۔ حقیقت جو بھی ہو مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قدیم دور کی نثر بھی مقفیٰ و مسجع عبارت اور تصنع آرائی کے سبب نظم سے کم نہ تھی۔ شاید اسی لئے کہا جاتا ہے کہ قدیم دور کے نثار نثر میں شاعری کرتے تھے۔ بہر حال زبان اپنے معاشرے اور سماجی حالات کی عکاسی کرتی ہے اور مختلف ادوار سے گذرنے کے بعد بھی اس کی تکمیل کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس طرح اس کی ادبی نشو و نما ہوتی رہتی ہے چنانچہ اردو زبان نے بھی اپنی عمر کے تقریباً ایک ہزار سال میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کرلیا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ کو ہم دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اوّل "قدیم اردو ادب" دوم "جدید اردو ادب"۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے ادب کو "قدیم اردو ادب" اور اس کے بعد کے ادب کو "جدید اردو ادب" کہتے ہیں۔ "قدیم اردو ادب" "ادب برائے ادب" کے نظرئے پر مبنی تھا جبکہ ۱۸۵۷ء کے بعد کا ادب "ادب برائے زندگی" کے نظرئے پر قائم ہے۔ قدیم اردو نظم و نثر حسن و عشق کی داستانوں، دیو پریوں کے قصّوں اور مافوق الفطرت واقعات سے پُر ہے۔ قدیم اردو ادب میں فطری جذبات، حقیقت پسندی، زندگی اور اس کے مسائل سے الگ تھلگ ہو کر نثار اور شعرا دونوں ہی طرح طرح سے اپنی زباں دانی کے جوہر دکھانے کو فنِ کمال سمجھتے تھے اسی لئے اُس دور کے ادب کو "ادب برائے ادب" کہا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف جدید ادب حقیقی زندگی اور اس کے مسائل کا ذکر کرتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی، اقتصادی و معاشرتی تغیرات، دلّی اور لکھنؤ کی سلطنتوں کا زوال، مغربی تہذیب اور جدید علوم کی آمد وغیرہ ایسے اسباب بنے جس نے اہلِ قلم کو مجبور کیا کہ وہ اپنی تحریر کے ذریعہ عوام کو خوابِ غفلت سے نہ صرف بیدار کریں بلکہ ان کے اندر وقت کے تقاضے کو سمجھنے، سوچنے اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ بھی پیدا کریں۔ چنانچہ انھیں احساسات کے نتیجہ میں شعر و شاعری اور

نثر نگاری کا انداز بدلنا شروع ہوا۔ قدیم اور فرسودہ طرز تحریر کو ترک کر کے نئے انداز سے نثر اور نظم لکھنے کا رجحان ہوا۔ یہی رجحان جدید نثر اور جدید نظم کے آغاز کا باعث بنا۔ جدید طرز کی نثر نگاری میں مرزا غالبؔ کا نام سرِفہرست ہے انھوں نے ۱۸۵۰ء کے آس پاس فارسی زبان میں خط وکتابت ترک کر کے اردو زبان میں خطوط لکھنے کا سلسلہ شروع کیا اس طرح انھوں نے اپنے خطوط کے ذریعہ جدید نثر کی بنیاد ڈالی۔

غالبؔ نے نثر نگاری کی پرانی روش چھوڑ کر آسان اور سب سے نرالے انداز میں خطوط لکھنے کی ابتدا کی۔ چونکہ جدید نثر کے آغاز کے سلسلہ میں غالب کے خطوط کی بہت بڑی اہمیت ہے اس لئے ان کے خطوط کی خصوصیات کا بھی مختصراً ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔

(۱) انھوں نے القاب وآداب کا پرانا و فرسودہ طریقہ بالکل ترک کر دیا۔

(۲) ان کے خطوط کی عبارت نہایت آسان اور مختصر ہے۔

(۳) خط کی تحریر مکالمہ کے انداز میں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ سے بالمشافہ بات چیت کر رہے ہیں۔

(۴) خطوط میں اکثر اپنے مخاطب کو غائب فرض کر لیتے ہیں۔

(۵) ان کے خطوط ظرافت سے بھرے ہوئے ہیں۔

(۶) غالبؔ کے خطوط اس زمانہ کے تاریخی حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مرزا غالبؔ نے جس جدید نثر کی بنیاد ڈالی اُس کو اردو کے عناصرِ خمسہ یعنی حالیؔ۔ سرسید۔ نذیر احمد۔ شبلیؔ اور محمد حسین آزادؔ نے اپنے اسلوبِ تحریر سے معراجِ کمال تک پہنچایا۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے مختلف پہلوؤں سے جدید نثر کو فروغ دیا۔ ان کی ادبی خدمات کو اردو ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ سرسید نے رسالہ تہذیب الاخلاقؔ کے ذریعہ اردو کو عام فہم اور ہر طرح کے مضامین کی ادائیگی کے قابل بنایا۔

نذیر احمد نے ناول نگاری کی بنیاد ڈالی تو حالیؔ، محمد حسین آزادؔ اور شبلیؔ نے سیرت نگاری، تنقید نگاری اور فلسفیانہ انداز میں مذہبی تاریخ لکھنے کا آغاز کیا۔ جدید نثر نگاری کا جو چشمہ مرزا غالبؔ کے ہاتھوں پھوٹا تھا وقت کے ساتھ ساتھ وہ زبردست دھارے میں بدل گیا۔

یہاں تک کہ عبدالحلیم شرر، رسوا، حسن نظامی، راشد الخیری، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریاآبادی پریم چند، فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، کرشن چندر اور سید مسعود حسن رضوی وغیرہ جیسے نثر نگاروں نے مختلف اصناف میں اپنے اچھوتے اور دلکش اندازِ تحریر سے نثرِ اردو کو مالا مال کر دیا۔ ناول، افسانے، ڈرامے، انشائیہ، تنقید، طنز و مزاح، خاکہ نگاری اور سیرت نگاری وغیرہ یہ سب جدید نثر نگاری کی دین ہیں۔

جدید نظم:۔ جدید نثر کی طرح جدید نظم بھی ۱۸۵۷ء کے بعد رائج ہوئی۔ حالی اور محمد حسین آزاد جدید شاعری کے بانی کہلاتے ہیں۔ انھوں نے ۱۸۷۴ء میں "انجمنِ پنجاب" کے زیرِ اہتمام نئے طرز کے مشاعروں کی بنیاد ڈالی۔ جس میں غزلیات سے ہٹ کر نظموں پر زور دیا گیا۔ مصرعہ طرح پر غزل کے اشعار کہنے کے مروجہ طریقہ کو ختم کر کے نظموں کے لئے عنوانات مقرر کئے گئے۔ مثلاً "برکھا رت"، "نشاطِ امید" اور "حبِ وطن" وغیرہ۔ ان عنوانات پر حالی نے خوبصورت نظمیں لکھیں۔ خوش قسمتی سے اس تحریک کو پنجاب کے ناظمِ تعلیمات کرنل ہالرائڈ کی بھرپور سرپرستی حاصل ہوئی۔ جدید نظم کے بانی اگرچہ حالی اور محمد حسین آزاد کہے جاتے ہیں مگر حقیقت ہے کہ نظیر اکبرآبادی نے ان سے تقریباً ایک صدی پہلے ہی جدید نظم کی بنیاد رکھ دی تھی وہ پہلے شاعر تھے جنھوں نے نیچرل شاعری کی ابتدا کی۔ انھوں نے مناظرِ قدرت، حب الوطنی اور ہندوستان کے تہواروں وغیرہ پر بہت سی نظمیں لکھیں مگر قدامت پرستوں نے ان کی زبان اور اندازِ شاعری کو غیر معیاری قرار دے کر شعرائے اردو کے زمرہ سے خارج کر دیا۔ بہرحال جدید نظم کی جو تحریکِ آزاد اور حالی نے شروع کی تھی وہ بہت جلد مقبولِ عام ہوئی اور ایسی ایسی ہستیاں ظہور میں آئیں جنھوں نے اپنی نظموں سے اردو ادب کے سرمایہ کو مالا مال کر دیا، مثلاً اسماعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، شوق قدوائی، رواں، سیماب، چکبست، ڈاکٹر اقبال، حفیظ جالندھری، جوش، احسان دانش اور مجاز وغیرہ۔

جدید شاعری نے صرف نظم ہی نہیں بلکہ صنفِ غزل کو بھی وسعت اور نیا اندازِ فکر بخشا۔ حالی، اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی، حسرت، اصغر، جگر، فانی، فراق، اور فیض احمد فیض وغیرہ کی غزلیات اس بات کی بیّن ثبوت ہیں۔ جدید نظم اور جدید غزل کی ترقی تقریباً ساتھ

ساتھ ہوتی رہی۔ جدید نظم کی خوبی یہ ہے کہ وہ تصنع، تکلف، مشکل پسندی، غیر فطری اذکار اور مبالغہ آرائی سے پاک ہے۔ نظم کا ہر اچھا شاعر زبان کی سادگی، صفائی اور عام فہم الفاظ کے ساتھ ساتھ نیچرل مضامین، زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعات کو فطری جذبات اور دلی احساسات کے ساتھ اصلی صورت میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ سننے والا بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے :۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
(غالب)

اردو ادب کی چند مشہور کتابوں کا تعارف

درسی اسباق عموماً جن کتابوں سے ماخوذ ہوتے ہیں ان کے متعلق بیشتر طلبہ کچھ نہیں جانتے یہ حقیقت ہے کہ جب تک اس کتاب کا زمانۂ تصنیف، ماحول، زبان، اسلوب تحریر اور اس کی ادبی حیثیت طلبہ کے ذہن میں نہ ہو اُس وقت تک موضوعِ بیان کو پڑھنے میں نہ تو مکمل لطف آتا ہے اور نہ ہی درسی سبق کے پڑھنے کا مقصد پورا ہوتا ہے اس کے علاوہ سبق کی افادیت اور اس کی لسانی اہمیت کو سمجھنے سے بھی طلبہ محروم رہ جاتے ہیں۔ اس لئے درسی اسباق کا پورا پورا استفادہ حاصل کرنے کے لئے اردو ادب کی چند مشہور کتابوں کا مختصراً تعارف کرانا ضروری سمجھا گیا۔

۱۔ سب رس

زمانۂ تصنیف کے اعتبار سے یہ اردو نثر کی پہلی کتاب تسلیم کی جاتی ہے جو ۱۶۳۵ء میں لکھی گئی۔ اس کے مصنف ملا وجہی ہیں۔ یہ دکنی ہندوستان کی ریاست گولکنڈہ کے باشندے تھے۔ "سب رس" سے پہلے اردو نثر کی کوئی مستند کتاب نہیں ملتی ہاں کچھ مذہبی رسالے ضرور ملتے ہیں مثلاً خواجہ سید گیسو دراز کا رسالہ "معراج العاشقین" جو ۱۴۰۵ء میں لکھا گیا اس کے علاوہ شمالی ہند میں اشرف جہانگیر سمنانی نے بھی ۱۳۰۸ء میں اخلاق و تصوف

پر ایک رسالہ لکھا تھا ان دونوں کو کتاب کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔"سب رس" ایک تمثیلی کتاب ہے اس کو گولکنڈہ کے بادشاہ عبداللہ قطب شاہ نے اپنے درباری شاعر ملاّ وجہی سے فرمائش کر کے لکھوائی تھی۔

"سب رس" کی خصوصیات :۔ اردو نثر کی ابتدائی کتاب ہونے کی وجہ سے ساڑھے تین سو سال قبل کی اردو اور اس کی لسانی حیثیت کا علم اس کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں دکنی ہندی، عربی، فارسی اور مرہٹی زبانوں کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اس میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو اب متروک ہو گئے ہیں۔ اس کتاب کی چند سطریں بطور نمونہ پیش ہیں۔

"حاجیاں جو کعبے کا قصد کرتے ہیں ہو باٹ گھاٹ کا مشقت ہور محنت جو سو لیتے ہیں، سو اس نیت سوں جو گناہ دور ہوئے، ہور خدا کی بخشش پاویں عاشقاں کوں دوست کے باٹ میں کھونا، جیو دینا خوشی ہو شادی ہو۔"

اس کتاب کا مرکزی خیال عشق حقیقی ہے ملاّ وجہی نے مسلسل استعاروں کے ذریعہ فرضی کرداروں کو لے کر اپنے مقصد کو ادا کیا ہے۔ اس کے لکھنے کا مقصد لوگوں میں اخلاقی و اصلاحی شعور پیدا کرنا ہے۔

"سب رس" کے کردار سب کے سب تمثیلی ہیں مثلاً دل، حسن، ہمت، نظر، عشق، اور لٹ وغیرہ ایسے کردار ہیں جو اپنی معنوی خصوصیات کے ساتھ کہانی میں اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ اس کتاب میں لفظی معنوں کے پیچھے اصل مطلب پوشیدہ ہیں۔ الغرض "سب رس" اپنی دلچسپ اندازِ تحریر کے علاوہ قدیم زبان، استعارے اور نفسِ مضمون کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اسی وجہ سے اس کتاب کو اردو ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔

۲۔ باغ و بہار

میر امنؔ دہلوی کی یہ کتاب اردو ادب کا مایۂ ناز سرمایہ ہے اس کتاب کے قصے کو مصنف نے کہاں سے لیا ہے۔ اس سلسلہ میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس قصہ کو میر امنؔ نے امیر خسرو کے "قصہ چہار درویش" سے ماخوذ کیا ہے۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ عطا حسین تحسین کی تصنیف "نوطرزِ مرصع" سے لیا ہے جو قصّہ چہار درویش کا اردو ترجمہ ہے۔

میر امّن نے فورٹ ولیم کالج میں بہت سی کتابوں کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا کام کیا، انھیں میں ایک "باغ و بہار" بھی ہے۔ اس کتاب کا سنہ تصنیف ۱۸۰۲ء ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب فارسی اردو زبان پر غالب تھی اور سلیس اردو لکھنا کسرِ شان سمجھا جاتا تھا۔ مگر میر امّن نے اس کتاب کو سلاستِ زبان اور روانیٔ بیان سے اس طرح آراستہ کیا کہ آج اردو ادب کو اس پر ناز ہے۔

باغ و بہار کی خصوصیات :- میر امّن دہلوی کا یہ ادبی شاہکار اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث زندۂ جاوید ہے۔ تقریباً دو سو سال گزر جانے کے بعد بھی اس کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ اس کتاب کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ جس کی سلاست، روانی، محاورے، استعارات اور لطافتِ زبان قابلِ تعریف ہے۔ اس میں اردو، فارسی، عربی اور ہندی کے الفاظ کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ "باغ و بہار" میں چار درویشوں کی آپ بیتی ہے جو باری باری ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ سب ہی قصّوں کے آپسی ربط اور تسلسل کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

"باغ و بہار" سے پہلے بھی کچھ داستانیں لکھی گئیں مگر ان کی زبان بہت مشکل تھی میر امّن نے اس کتاب کے ذریعہ سادہ اور سلیس زبان کی بنیاد ڈالی۔ چونکہ اُس دور میں قدیم طرزِ تحریر اور مشکل پسندی کو قابلیت کی کسوٹی سمجھا جاتا تھا اس لئے "باغ و بہار" کی سادہ اور آسان زبان کو دیکھ کر میر امّن کا مذاق اُڑایا گیا مگر جیسے جیسے آسان اردو کا رواج بڑھتا رہا یہ کتاب مقبولیت کے مدارج طے کرتی رہی۔ آج بھی اردو داں طبقہ اس کتاب پر فخر کرتا ہے اور اس کو اردو ادب کا سرمایۂ عظیم سمجھتا ہے۔

۲۔ فسانۂ عجائب

رجب علی بیگ سرور کی یہ تصنیف اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب

۱۸۳۱ء میں مکمل طور پر تصنیف ہوئی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ رجب علی بیگ سرورؔ نے میر امن کی تصنیف" باغ و بہار" کے جواب میں یہ کتاب لکھی تھی۔

فسانۂ عجائب کی خصوصیات:۔ رجب علی بیگ لکھنؤ کے رہنے والے تھے ان کو لکھنوی طرزِ معاشرت اور وہاں کی زبان سے خاص لگاؤ تھا چنانچہ انھوں نے فسانۂ عجائب میں اپنی پُرتکلف عبارت، مشکل پسندی، عربی و فارسی کے کثیر الفاظ، مقفیٰ و مسجع عبارت، تشبیہات و استعارات اور رنگینیٔ بیان کے ایسے ایسے جوہر دکھائے ہیں کہ تقریباً پونے دو سو سال گزر جانے کے بعد بھی یہ کتاب اردو ادب میں ایک بے مثال ادبی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے

" فسانۂ عجائب" مافوق الفطرت واقعات اور کردار پر مبنی ایک داستان ہے جو دیو، پریوں جادوگروں، بادشاہوں، بیگمات اور شہزادیوں کے گرد گھومتی ہے۔ اس کہانی کو جنم دینے والا وہ طوطا ہے جس کی زبان سے شہزادہ" جان عالم" " انجمن آرا" کے حسن و جمال عالی وقار اور خوش گفتار ہونے کی تعریف سن کر اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی تلاش میں محل سے نکل پڑتا ہے۔

اس کتاب کی عبارت کو پڑھ کر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رجب علی بیگ سرورؔ نے نثر میں شاعری کی ہے۔ "فسانۂ عجائب" لکھنوی تہذیب و تمدن، طرزِ معاشرت اور وہاں کی زبان کا آئینہ دار ہے۔ سرورؔ سے پہلے بھی کچھ لوگوں نے مقفیٰ و مسجع اردو میں نثری کتابیں لکھی ہیں مگر "فسانۂ عجائب" اپنی خصوصیات کے باعث سب سے نرالی ہے۔ یہ قدیم نثر اور اسلوب تحریر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں اس کتاب کو بہت مقبولیت حاصل ہے۔

۴۔ فسانۂ آزاد

رتن ناتھ سرشارؔ کی یہ سب سے مشہور تصنیف ہے جو "فسانۂ عجائب" کے تقریباً پچاس سال بعد ۱۸۷۸ء میں لکھی گئی۔ سرشارؔ " اودھ اخبار" لکھنؤ کے اڈیٹر تھے۔ انھوں نے فسانۂ آزاد کو اسی اخبار کے لئے قسط وار لکھنا شروع کیا۔ جسے بعد میں چار ضخیم جلدوں میں "فسانۂ آزاد

کے نام سے شائع کیا گیا۔ اس کتاب میں رتن ناتھ سرشار نے لکھنؤ کی پرانی تہذیب و تمدن، معاشرت، آداب شاہی، طرز گفتگو، شادی بیاہ، میلے ٹھیلے، تہوار اور رسم و رواج وغیرہ کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ یہ کتاب اپنی مخصوص طرز تحریر اور رنگینیٔ زبان کی وجہ سے اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں لکھیں جیسے سیر کوہسار۔ جام سرشار۔ کامنی۔ خدائی فوجدار لیکن جو مقبولیت فسانۂ آزاد کو حاصل ہوئی وہ ان کی کسی اور تصنیف کو نہ ہوئی۔

فسانۂ آزاد کی خصوصیات:۔ فسانۂ آزاد کی زبان خالص لکھنوی زبان ہے۔ اس کتاب میں مزاح کے بہترین نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ فسانۂ آزاد کا طرزِ تحریر شگفتہ، دلچسپ اور پُرمذاق ہے۔ اس کی زبان نہایت مرصع اور رنگین ہے، جگہ جگہ محاورات، استعارات اور تشبیہات کے استعمال نے عبارت کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ "فسانۂ عجائب" کے مقابلہ میں اس کی زبان سلیس اور سادہ ہے مگر پھر بھی "فسانۂ آزاد" کی زبان اور اسلوب تحریر قدیم طرز کی نثر نگاری میں شمار کی جاتی ہے۔

فسانۂ آزاد کے دو اہم کردار ہیں۔ "خوجی" اور "میاں آزاد"۔ یہ دونوں دو تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں خوجی مٹتی ہوئی مشرقی تہذیب کا دلدادہ ہے تو "آزاد" مغربی تہذیب کا علمبردار ہے جس سے ابھی لوگ پوری طرح آگاہ نہیں ہیں۔ فسانۂ آزاد میں مختلف مسئلوں کو لے کر مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا ٹکراؤ دکھایا گیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر لکھنؤ کی سماجی زندگی، عوام کی بے فکری اور حکمران اودھ کی رنگ رلیوں سے بھری ہوئی زندگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اس کتاب میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس کے واقعات اور مضامین میں ربط و تسلسل نہیں پایا جاتا اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مصنف نے یکسوئی کے ساتھ اس ناول کو مسلسل نہیں لکھا

۵۔ مثنوی سحر البیان

مثنوی "سحر البیان" اردو زبان کی بہترین مثنوی ہے اس کے مصنف میر انیس کے دادا

میر حسن ہیں جو دلی کی تباہی سے متاثر ہو کر لکھنؤ آ گئے تھے۔ یہ مثنوی ۱۷۸۵ء کے آس پاس ہیں لکھی گئی۔ اس سے پیشتر بہت سی مثنویاں لکھی گئیں مگر اس سے زیادہ مقبولیت کسی اور مثنوی کو حاصل نہ ہو سکی۔ صنفِ مثنوی کی تمام خوبیاں اس میں پائی جاتی ہیں۔ مثنوی "سحر البیان" میر حسن کا وہ ادبی شاہکار ہے جس کو اردو ادب فراموش نہیں کر سکتا۔ میر تقی میر اگر شہنشاہِ غزل اور سودا شہنشاہِ قصیدہ ہیں تو میر حسن شہنشاہِ مثنوی ہیں۔

مثنوی سحر البیان کی خصوصیات :- مثنوی "سحر البیان" اگرچہ لکھنؤ میں لکھی گئی مگر اس میں دبستانِ دلی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس کی زبان نہایت سادہ، سلیس، بے تکلف اور رواں ہے۔ میر حسن نے محاورے، ضرب الامثال، سنگارے، روزمرہ اور تشبیہات وغیرہ کا استعمال کمال خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ "سحر البیان" میں لکھنؤ کی طرز معاشرت، رسم و رواج شادی بیاہ اور گہنے زیور وغیرہ کا تفصیل سے ذکر ہے۔ میر حسن کو منظر کشی میں ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ اس مثنوی میں جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے ان کا پورا نقشہ نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ مثنوی کیا ہے الفاظ، تشبیہات، و محاورات کا بہتا ہوا دریا ہے۔ آج بھی اس مثنوی کے بہت سے اشعار، محاورے اور تشبیہات زبان زد ہیں۔ اس مثنوی میں شہزادہ بے نظیر اور بدر منیر کے عشق کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے خاص کردار شہزادہ بے نظیر (ہیرو) بدر منیر (ہیروئن) اور نجم النسا، (بدر منیر کی سہیلی) ہیں۔

۶۔ مثنوی گلزارِ نسیم

مثنوی "سحر البیان" اور مثنوی "گلزارِ نسیم" اردو ادب کی دو مایہ ناز مثنویاں ہیں۔ دونوں مثنویاں اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فوقیت رکھتی ہیں۔

مثنوی "گلزارِ نسیم" کے مصنف دیا شنکر نسیم لکھنؤ کے ایک معزز کشمیری خاندان میں پیدا ہوئے تھے انھوں نے ۱۸۳۸ء میں مثنوی گلزارِ نسیم لکھی۔ یہ مثنوی پہلے کافی طویل تھی مگر اپنے استاد آتش کے مشورے پر اس کو دو تہائی کم کر دیا۔ اس مثنوی کی بہت سی خوبیاں ہیں مگر اس کی سب سے اہم خوبی اس کا اختصار اور نادر تشبیہات ہیں۔ اس کے بیشتر اشعار میں

صنائع لفظی یا صنائع معنوی کی کوئی نہ کوئی صنعت پائی جاتی ہے۔ اس مثنوی میں بھی لکھنؤ کی نزاکت، آدابِ گفتگو، اور طرزِ معاشرت کی جھلک ملتی ہے۔ چونکہ گلزار نسیم کے مقابلہ "سحر البیان" میں واقعات کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے کچھ نقاد کا یہ کہنا درست ہے کہ "دیا شنکر نسیم نے یہ مثنوی لکھ کر دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے"۔ اس مثنوی کے خاص کردار شہزادہ "تاج الملوک" اس کی محبوبہ "بکاولی" اور بکاولی کی سہیلی "روح افزا" ہیں۔ یہ مثنوی زبان کی لطافت سادگی، اختصار، معنویت، تشبیہات، کردار اور پلاٹ وغیرہ کے اعتبار سے اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہے۔

۷۔ امراؤ جان ادا

مرزا ہادی رسوا کے ناولوں میں "امراؤ جان ادا" سرِ فہرست ہے۔ یہ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس" کی اشاعت کے تیس سال بعد ۱۸۹۹ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ امراؤ جان ادا کو اردو کا پہلا معیاری اور فنی اعتبار سے مکمل ناول ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ ناول ۱۸۵۷ء سے پہلے کے سماجی ماحول، لکھنؤ کے زوال پذیر کلچر اور اس کے اثرات کی سچی تصویر پیش کرتا ہے۔ مرزا نے اس ناول کا بنیادی کردار ایک طوائف کو بنایا ہے جس کا نام "امراؤ جان ادا" ہے۔

اس ناول کی مختصراً کہانی اس طرح ہے۔ امراؤ جان ادا فیض آباد کے ایک سرکاری ملازم کی بیٹی ہے۔ اس کے والد نے اپنے پڑوسی دلاور خاں کے خلاف گواہی دی تھی۔ اس نے دشمنی میں اس کی کمسن بیٹی امیرن کو جو بعد میں طوائف بن کر امراؤ جان ادا کے نام سے مشہور ہوئی اغوا کر لیا اور لکھنؤ کی ایک طوائف کے ہاتھ بیچ دیا۔ جلد ہی وہ لکھنؤ کی مقبول ترین طوائف بن گئی۔ اس کے عاشقوں میں نواب سلطان مرزا، ڈاکو فیضو اور مرزا گوہر قابلِ ذکر ہیں۔ امراؤ جان نے ان سب کو اپنانے کی بہت کوشش کی مگر مایوسی کے سوا اس کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ امراؤ جان ایک شب فیضو کے ساتھ کوٹھے سے فرار ہو جاتی ہے۔ کئی سالوں تک اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد وہ پھر لکھنؤ کے کوٹھے پر آجاتی ہے۔

اتفاق سے فیض آباد کے ایک مجرے میں اس کی ملاقات گم شدہ ماں سے ہو گئی۔ بھائی سے رسوائی برداشت نہ ہوئی اور اسے قتل کرنا چاہا مگر پھر بہن کے رشتہ کا خیال کر کے چھوڑ دیا۔ امراؤ اگلے ہی دن فیض آباد سے لکھنؤ چلی آئی اس طویل عرصہ میں امراؤ جان کا واسطہ مختلف طرح کے مردوں سے پڑا۔ بالآخر وہ کربلائے معلیٰ کی زیارت کو جاتی ہے اور وہاں سے لوٹ کر کوٹھے پر بیٹھنا بند کر کے شاعری اور موسیقی کو اپنی بقیہ زندگی کا مشغلہ بناتی ہے۔

اس ناول میں رسوا نے نفسیاتی مطالعہ کے ذریعہ کرداروں کی خوبیاں اور کمزوریاں واضح کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ رسوا کی نثر میں منظر نگاری، مکالمے اور لطفِ زبان کے ساتھ ساتھ ظرافت بھی بدرجہ اتم ہے۔ انھیں خوبیوں کے سبب اس ناول کو اردو ادب میں ایک ممتاز اور منفرد حیثیت حاصل ہے۔

ادبا و شعراء کی ترتیب بہ اعتبار زمانہ اور ان کی مشہور تصانیف

اردو ادب کے مشہور مصنفین اور ان کی خاص تصانیف کو زمانۂ پیدائش کے اعتبار سے ترتیب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح مختلف ادبا، اور اردو کے مشہور تصانیف کی آپسی مدت کے فاصلہ کا کسی حد تک اندازہ کیا جاسکے گا۔ اس کے علاوہ اردو کے مشہور شعراء کی سنہ ولادت اور وفات کو بتاتے ہوئے ان کا پورا نام اور ان کی مخصوص صنفِ شاعری کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اس کے ذریعہ اول، متوسط اور آخیر کے دور کے ادبا، و شعراء کے نام کا نہ صرف تعین کیا جاسکتا ہے بلکہ مختلف الزمانہ یا ہم عصر ادباء و شعراء کو بھی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ کچھ ادباء و شعراء کی سنہ ولادت یا وفات مختلف کتابوں میں مختلف درج ہے۔ راقم الحروف جب کئی مستند کتابوں سے سنین کی تصدیق کرنے کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوا تو "اردو انسائیکلوپیڈیا" سے ان کے سنین کی تصدیق کی پھر اسی کو درست مان کر درج کیا۔ پھر بھی غلطی ہوسکتی ہے جس کے لئے قارئین حضرات معاف فرمائیں۔

نوٹ :۔ سنین کے تصدیق کے لئے مندرجہ ذیل کتب سے مدد لی گئی :۔

(۱) تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ) (۲) داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری) (۳) تاریخ ادب اردو (سید اعجاز حسین) (۴) تعارف تاریخ اردو (شجاعت علی سندیلوی) (۵) تاریخ ادب اردو (جمیل جالبی)۔ (۶) داستان تاریخ اردو (احسن مارہروی) (۷) تاریخ ادب اردو (ڈاکٹر نذیر احمد) (۸) اردو انسائیکلوپیڈیا۔

اردو کے مشہور مصنفین و شعراء کی کچھ خاص تصانیف

(ترتیب سنہ پیدائش کے لحاظ سے)

نمبر شمار	نام	سنہ پیدائش	وفات	مشہور تصانیف
۱	امیر خسرو	۱۲۵۳ء	۱۳۲۵ء	خالق باری (ہندی، فارسی اور ترکی الفاظ کی ملی جلی شاعری
۲	خواجہ سید گیسو دراز	۷۲۱ھ	۸۲۵ھ	معراج العاشقین سنہ تصنیف تقریباً سنہ ۱۴۰۵ء
۳	ملا وجہی	۱۵۵۰ء –	۱۵۸۱ء کے درمیان	سب رس سنہ ۱۶۳۵ء (اردو کی اولین نثری کتابوں میں سے ایک)
۴	فضل علی فضلی	۱۷۱۰ء		کربل کتھا (دہ مجلس) شمالی ہند کی پہلی نثری تصنیف سنہ ۱۷۳۲ء
۵	میر امن	۱۸ویں صدی	۱۸۶۷ء	باغ و بہار (سنہ ۱۸۰۲ء)
۶	میر حسن	۱۷۳۶ء	۱۷۸۶ء	مثنوی سحر البیان سنہ ۱۷۸۵ء میں لکھی گئی۔
۷	رجب علی بیگ سرور	۱۷۸۶ء	۱۸۶۷ء	فسانۂ عجائب (سنہ ۱۸۲۴–۳۱ء)
۸	مرزا غالب	۱۷۹۶ء	۱۸۶۹ء	عود ہندی — اردوئے معلی ۔ دیوانِ غالب
۹	دیا شنکر نسیم	۱۸۱۱ء	۱۸۴۳ء	مثنوی گلزار نسیم سنہ ۱۸۳۸ء
۱۰	سر سید احمد خاں	۱۸۱۷ء	۱۸۹۸ء	آثار الصنادید ۔ تفسیر القرآن ۔ خطبات احمدیہ مضامینِ سر سید ۔ رسالہ تہذیب الاخلاق ۔ رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند ۔
۱۱	محمد حسین آزاد	۱۸۳۲ء	۱۹۱۰ء	دربارِ اکبری ۔ آبِ حیات ۔ نیرنگِ خیال ۔ قندِ پارسی

۱۲	ڈپٹی نذیر احمد	۱۸۳۶ء	۱۹۱۲ء	مراۃ العروس ۔ توبۃ النصوح ۔ بنات النعش ابن الوقت ۔
۱۳	الطاف حسین حالی	۱۸۳۷ء	۱۹۱۴ء	یادگارِ غالب ۔ حیات جاوید ۔ حیات سعدی ۔ مقدمہ شعر و شاعری ۔ مسدس حالی ۔
۱۴	رتن ناتھ سرشار	۱۸۴۷ء	۱۹۰۲ء	فسانۂ آزاد ۔ سیرِ کہسار ۔ خدائی فوجدار ۔ کامنی
۱۵	شبلی نعمانی	۱۸۵۷ء	۱۹۱۴ء	شعر العجم ۔ موازنہ انیس و دبیر ۔ الفاروق ۔ المامون سیرۃ النعمان ۔
۱۶	مرزا ہادی رسوا	۱۸۵۸ء	۱۹۳۱ء	امراؤ جان ادا ۔ اختری بیگم ۔ ذاتِ شریف ۔ شریف زادہ
۱۷	عبدالحلیم شرر	۱۸۶۰ء	۱۹۲۶ء	فردوسِ بریں ۔ ایامِ عرب ۔ منصور موہنا ۔ مضامین شرر
۱۸	راشد الخیری	۱۸۶۸ء	۱۹۳۶ء	صبحِ زندگی ۔ شامِ زندگی ۔ شبِ زندگی ۔ آمنہ کا لال ۔ ماہِ عجم ۔
۱۹	علامہ اقبال	۱۸۷۶ء	۱۹۳۸ء	بانگِ درا ۔ بالِ جبریل ۔ ضربِ کلیم
۲۰	حسن نظامی	۱۸۷۸ء	۱۹۵۷ء	غدر کے حالات ۔ میلاد نامہ ۔ یزید نامہ ۔ بیوی کی تعلیم
۲۱	منشی پریم چند	۱۸۸۰ء	۱۹۳۷ء	غبن ۔ میدانِ عمل ۔ گئو دان ۔ چوگانِ ہستی ۔ نرملا بازارِ حسن ۔ عافیت وغیرہ ۔
۲۲	فرحت اللہ بیگ	۱۸۸۳ء	۱۹۴۷ء	دہلی کا یادگار مشاعرہ ۔ نذیر احمد کی کہانی ۔ مضامین فرحت
۲۳	ابوالکلام آزاد	۱۸۸۸ء	۱۹۵۸ء	غبارِ خاطر ۔ مضامینِ ابوالکلام آزاد ۔ کاروانِ خیال ہماری آزادی ۔
۲۴	شبیر حسن جوش	۱۸۹۴ء	۱۹۸۲ء	نقش و نگار ۔ فکر و نشاط ۔ عرش و فرش ۔ سنبل و سلاسل شعلہ و شبنم
۲۵	رشید احمد صدیقی	۱۸۹۶ء	۱۹۷۷ء	خنداں ۔ گنجہائے گرانمایہ ۔ ہم نفسانِ رفتہ آشفتہ بیانی میری ۔ مضامینِ رشید ۔ ہمارے ذاکر صاحب

اردو کے مشہور شعراء کے نام اور صنفِ سخن کے اعتبار سے نمائندہ شاعر

(ترتیب سنہ پیدائش کے لحاظ سے)

نمبر شمار	تخلص	پورا نام	نمائندہ شاعر	پیدائش	وفات
۱	خسرو	ابوالحسن	اردو کے پہلے شاعر (ہندی اور فارسی کی ملی جلی شاعری)	۱۲۵۳ء	۱۳۲۵ء
۲	ولی دکنی	ولی محمد ولی	غزل	۱۶۶۸ء	۱۷۴۲ء
۳	سودا	مرزا محمد رفیع سودا	قصیدہ	۱۷۱۰ء	۱۷۸۱ء
۴	درد	خواجہ میر درد	غزل	۱۷۲۰ء	۱۷۸۴ء
۵	میر	میر تقی میر	غزل	۱۷۲۳ء	۱۸۱۰ء
۶	نظیر اکبرآبادی	ولی محمد	نظم	۱۷۳۵ء	۱۸۲۵ء
۷	میر حسن	میر غلام حسن	مثنوی	۱۷۳۶ء	۱۷۸۶ء
۸	مصحفی	شیخ غلام ہمدانی	غزل	۱۷۵۰ء	۱۸۲۴ء
۹	انشا	انشاءاللہ خاں	غزل	۱۷۵۶ء	۱۸۱۷ء
۱۰	آتش	خواجہ حیدر علی	غزل	۱۷۷۸ء	۱۸۴۶ء
۱۱	ذوق	شیخ محمد ابراہیم	قصیدہ	۱۷۸۹ء	۱۸۵۴ء
۱۲	غالب	مرزا اسداللہ خاں	غزل	۱۷۹۶ء	۱۸۶۹ء
۱۳	مومن	حکیم مومن خاں مومن	غزل	۱۸۰۰ء	۱۸۵۱ء
۱۴	انیس	میر ببر علی	مرثیہ	۱۸۰۲ء	۱۸۷۴ء

۱۵	دبیر	مرزا سلامت علی	مرثیہ	۱۸۰۳ء	۱۸۷۵ء
۱۶	نسیم	دیا شنکر	مثنوی	۱۸۱۱ء	۱۸۴۴ء
۱۷	امیر مینائی	امیر احمد	غزل	۱۸۲۸ء	۱۹۰۰ء
۱۸	داغ	نواب مرزا خاں	غزل	۱۸۳۱ء	۱۹۰۵ء
۱۹	اکبر الٰہ آبادی	اکبر حسین رضوی	نظم (طنزیہ)	۱۸۴۶ء	۱۹۲۱ء
۲۰	حسرت	فضل الحسن	غزل	۱۸۷۸ء	۱۹۵۱ء
۲۱	اقبال	شیخ محمد اقبال	نظم	۱۸۷۷ء	۱۹۳۸ء
۲۲	فانی	شوکت علی خاں	غزل	۱۸۷۹ء	۱۹۴۲ء
۲۳	چکبست	برج نرائن	نظم	۱۸۸۲ء	۱۹۲۶ء
۲۴	اصغر	اصغر حسین	غزل	۱۸۸۴ء	۱۹۳۶ء
۲۵	جگر	علی سکندر	غزل	۱۸۹۰ء	۱۹۶۰ء
۲۶	فراق	رگھوپتی سہائے	غزل	۱۸۹۶ء	۱۹۸۲ء
۲۷	مجاز	اسرار الحق	نظم	۱۹۱۱ء	۱۹۵۵ء
۲۸	فیض	فیض احمد	نظم	۱۹۱۱ء	۱۹۸۴ء

رموزِ اوقاف (Punctuation)

اردو زبان کے طلبہ کو اوقاف یعنی عبارت کو لکھنے یا پڑھنے کے دوران کہاں پر کتنا وقفہ دینا چاہئے اور اس کی کیا علامت ہوتی ہے' اس کے متعلق بہت کم معلومات ہے۔ اردو قواعد کی کتابوں میں بھی ان کا ذکر نہیں کے برابر ہے۔ اردو زبان کے بیشتر اساتذہ بھی طلبہ کی توجہ اس طرف مبذول نہیں کراتے جب کہ انگریزی زبان کی تعلیم میں اوقاف۔ Punctuation کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ ان کی اہمیت کے پیش نظر اوقاف یا ٹھہراؤ کی علامتوں اور ان کے موقع استعمال کے متعلق بتانا ضروری سمجھا گیا:۔

اوقاف جمع وقفہ (ٹھہراؤ) کی ہے۔ اوقاف ان علامتوں کا نام ہے جو ایک جملے کو دوسرے جملے سے یا ایک ہی جملہ کے ایک حصہ کو اُس کے دوسرے حصہ سے الگ کرتے ہیں۔ عبارت میں ان اوقاف کا فائدہ یہ ہے کہ ان علامتوں کے ذریعہ جہاں مختصر یا طویل ٹھہراؤ کی ضرورت ہو وہاں ٹھہرا جائے۔ نظر کو اس سے سکون ملتا ہے اور تھکنے بھی نہیں پاتی۔ قاری ہر جملے یا اس کے جزو کے اصل مفہوم کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے اور اس کے ذہن پر کوئی بار نہیں پڑتا۔ اس کے علاوہ اوقاف کی مدد سے جملوں کے درمیان آپس میں الجھاؤ یا پیچیدگی نہیں پیدا ہونے پاتی۔ وقفوں کے لئے جو علامتیں استعمال کی جاتی ہیں ان کے نام، بناوٹ اور موقع استعمال کے بارے میں بتایا گیا ہے آپ انھیں غور سے پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کیجئے:۔

نمبر شمار	وقفے کی علامتیں	اردو نام	انگریزی نام
۱	،	سکتہ (چھوٹا ٹھہراؤ)	Comma
۲	؛	وقفہ (ٹھہراؤ)	SemiColon
۳	:	رابطہ	Colon

Colon and dash	تفصیلہ	:-	۴
Full Stop	ختمہ	—	۵
Note of exclamation	ندائیہ، فجائیہ	!	٦
Sign of interrogation	سوالیہ نشان	؟	۷
Dash	خط	——	۸
Brackets	قوسین	( ) - [ ]	۹
Inverted Commas	واوین	" "	۱۰

(۱) سکتہ (،) Comma

یہ سب سے مختصر وقفہ کی علامت ہے۔ مندرجہ ذیل موقعوں پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔

(۱) اُن اسما یا ضمائر کے درمیان جو ایک دوسرے کے بدل کا کام دیتے ہیں جیسے ہمایوں، ابن بابر، شہنشاہِ ہند نے ......

(۲) ایک ہی طرح کے تین یا تین سے زائد الفاظ جو ساتھ ساتھ استعمال کئے گئے ہوں ان کے درمیان سکتہ کی علامت استعمال ہوتا ہے لیکن اس صورت میں جب کہ آخر کے دو لفظوں کو حرف عطف (و) (اور) یا حرف تردید (یا) کے ذریعہ جوڑا گیا ہو جیسے

۱۔ دریا، پہاڑ و جنگل۔

۲۔ میل، محبت اور اخلاق۔

۳۔ دنیا کی تمام جنگیں زر، زن یا زمین کے لئے ہوئیں۔

(۳) جملے کے ان اجزاء کے درمیان جو تشریحی ہوں:۔

۱۔ یہ حوض ۱۵ فٹ لمبا، ۱۰ فٹ چوڑا، ۵ فٹ گہرا ہے۔

۲۔ بڑھیا کے مرنے کا غم نہیں، فرشتوں نے گھر دیکھ لیا۔

۳۔ آگ کا دریا، قرۃ العین حیدر کا بہترین ناول ہے۔

۴۔ آزادی کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس میں مذہب، معاش، رسم و رواج، نقل

وحرکت، بود و باش، لباس، خوراک، تعلیم، تقریر، تحریر اور خیال وغیرہ سے متعلق مکمل خود مختاری ہے۔

(۴) عبارت اور خصوصاً شعر کے اندر الفاظ کے الٹ پھیر سے پیدا ہونے والی پیچیدگی کو دور کرنے کے لئے بھی سکتہ کا استعمال ہوتا ہے:۔

نید میں یعقوب نے لی، گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں، روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

۲۔ وقفہ (؛) Semicolon

(۱) کئی لفظوں کے درمیان جب سکتہ کی علامت لگی ہو تو کبھی کبھی جملہ کے آخری جزو سے پہلے طویل وقفے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے ایسے موقعوں پر سکتہ کی علامت نہ لگا کر آخری ٹکڑے سے پہلے وقفہ کی علامت (؛) لگاتے ہیں۔ (۱) احمد آباد، میرٹھ، علی گڑھ، بھاگل پور؛ ان سب شہروں میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔

(۲) جہاں تاب آفتاب، یہ چودھویں کا چاند، یہ اندھیری راتوں کے تارے، یہ نیلگوں آسمان؛ سچ پوچھئے تو اپنے اپنے محل پر سب لاالہٰ خود رو ہیں۔

(۳) جس عبارت میں بڑے بڑے جملوں کے درمیان لہذا، اگرچہ، لیکن، ورنہ، تاہم، چنانچہ، جب کہ، حالاں کہ، بشرطے کہ یا اسی قسم کے دیگر الفاظ جو جملوں کے ربط کو برقرار رکھنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ان سے پہلے وقفہ کی علامت لگائی جاتی ہے لیکن یاد رہے کہ جب مذکورہ بالا الفاظ چھوٹے چھوٹے فقروں کو ملاتے ہوں تو وقفہ کی علامت نہ لگا کر سکتہ کی ہی علامت لگائیں گے۔

(۱) "سنو! عالَم دو ہیں، ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گِل؛ ہر چند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گِل کے مجرم، عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح

کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں ؛ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔

(۲) مولانا آزاد اپنی حق پسندی ، بیدار مغزی اور وسیع القلبی کے باعث ہندوستان کے ہر طبقے، ہر قوم اور برادری میں ہر دلعزیز تھے ، انھوں نے اپنی قومی یکجہتی کے نظریہ کو عوام کے سطحی نظریہ کا تابع نہیں بنایا ، بلکہ بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اپنے قومی ویکجہتی نظریات کو عوام کے دلوں میں اتارنے کے لئے حتی المقدور کوشاں رہے ؛ اگرچہ بدباطنوں اور تنگ نظر مخالفوں نے ان پر کئی بار الزام تراشیاں کیں ؛ تاہم زندگی کے آخری لمحات تک وہ اپنے نظریات اور اصولوں پر اٹل رہے ۔

۳ ۔ جب جملوں کے ایسے دو حصوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا پڑے جن میں اندرونی طور پر سکتہ موجود ہو یعنی دونوں جملوں میں سکتہ کی علامت کے ذریعہ ایک ہی نوعیت کی دو یا دو سے زائد باتیں الگ الگ کہی گئیں ہوں ان کے درمیان وقفہ کی علامت آتی ہے ۔

(۱) گنگا ، جمنا ، گھاگھرا اور گومتی شمالی ہند کی ؛ مہاندی ، گوداوری ، کرشنا اور کاویری جنوبی ہند کی بڑی ندیاں ہیں ۔

(۲) محمد حسین آزاد کی آبِ حیات ، نیرنگ خیال ، دربار اکبری ؛ شبلی نعمانی کی موازنۂ انیس و دبیر، الفاروق ، سیرت النبی ؛ الطاف حسین حالی کی حیات جاوید ، یادگار غالب ، حیات سعدی اردو ادب کی مایۂ ناز تصانیف ہیں ۔

(۳) جو جاگے گا ، سو پائے گا ؛ جو سوئے گا وہ کھوئے گا ۔

۳۔ رابط (:) Colon

۱۔ اس کا ٹھہراؤ وقفہ کے ٹھہراؤ سے کچھ زیادہ ہوتا ہے ۔ بڑے جملوں میں جب کسی ایسی بات کی تشریح یا تائید کرنی ہوتی ہے جو پہلے کہی جا چکی ہے تو ایسے موقعوں پر رابط کی علامت (:) استعمال کرتے ہیں :

(۱) مغربی تہذیب ہمیں قلبی سکون سے عاری ، روحانی عقائد سے دور عارضی رنگینوں کا شیدا، خدا اور اس کی قدرتِ کاملہ کا منکر بناتی ہے : خدا اس لعنت سے ہم سب کو بچائے ۔

۲۔ کسی کے قول یا کہاوت کی نقل کرنے سے پہلے رابطہ کی علامت لاتے ہیں :

(۱) بزرگوں کا قول ہے : "صبح کا بھولا شام کو گھر آئے تو بھولا نہیں کہتے ۔"

۳۔ مثالوں سے پہلے :

دہلی میں مسلم دورِ حکومت کی بہت سی تاریخی عمارتیں ہیں : قطب مینار، لال قلعہ، جامع مسجد، ہمایوں کا مقبرہ ۔

۴۔ الفاظ اور اس کے معنی کے درمیان رابطہ کی علامت لاتے ہیں :

سعی پیہم : مسلسل کوشش ۔ کامرانی : کامیابی

۵۔ شعر یا مصرعہ کا حوالہ دینے سے پہلے :

(۱) حضرت ابھی سے گھبرا گئے : آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا ۔

(۲) انگریزی کا ایک مقولہ ہے : ہر وہ شے جو چمکتی ہے، سونا نہیں ہوتی ۔

۶۔ ایسے دو جملوں کے درمیان جو آپس میں متقابل یا متضاد ہوں اور دونوں مل کر کسی ایک بات کو مکمل طور سے واضح کرتے ہوں جیسے گھر چھوٹا ہے تو کیا : دل تو بڑا ہے ۔

۷۔ ایسے دو جملوں کے درمیان بھی رابطہ کی علامت آتی ہے جو ایک دوسرے کی توجیہہ تو کرے مگر اس کے بیچ میں حرف توجیہہ نہ ہو ۔

(۱) چارپائی اور مذہب ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے : وہ اسی پر پیدا ہوتا ہے اور یہیں سے جیل خانہ، کونسل یا عدم کا راستہ لیتا ہے ۔

۴۔ تفصیلہ (:۔) Colon and dash

یہ علامت حسب ذیل موقعوں پر استعمال کی جاتی ہے ۔

۱۔ جب کسی اقتباس یا فہرست کو پیش کرنا ہوتا ہے ۔ جیسے :۔

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک موقع پر کہا تھا :۔

"اگر آسمان سے اتر کر کوئی فرشتہ قطب مینار کی چوٹی سے یہ اعلان کرے کہ ابھی آزادی مل سکتی ہے بشرطیکہ ہندو مسلم آپسی اتحاد کو ختم کر دیں، تو میں ان سے کہوں گا کہ ہمیں ایسی آزادی

نہیں چاہئے کیونکہ ....

۲۔ یہ علامت ایک ہی طرح کے جملوں کی تکرار کے بعد اعادہ کے طور پر ایسے موقع پر آتی ہے جہاں "الغرض"۔ "کہنے کا مقصد یہ ہے" یا "مختصر یہ ہے" لکھنے کی ضرورت محسوس ہوا کرتی ہے۔ ان الفاظ کو نہ لکھ کر تفصیلہ کی علامت لگاتے ہیں۔ جیسے:

" مولانا آزاد ایک نادر روزگار اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان جیسی گوناگوں اوصاف و محاسن سے بھرپور شخصیت بہت کم ملے گی۔ مثلاً علم و فضل، حقائق دین، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، تصنیف و تالیف، تقریر و خطابت، اخبار نویسی و صحیفہ نگاری، سیاست و ملک داری:۔ وہ کون سا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے جس میں آپ کی قابلیت مسلم الثبوت نہ ہو۔"

۳۔ ایک ہی جملہ میں جب کئی باتیں کہی گئی ہوں۔

(۱) ناریل کے فوائد بے شمار ہیں:۔ اس کا تیل جلاتے ہیں، کھانے میں ڈالتے ہیں، خول سے ڈونگے بنتے ہیں۔ ریشہ رسیوں کے بٹنے میں کام آتا ہے۔ کچا ہو تو اس کا پانی پیتے ہیں۔

۴۔ کسی اصول یا قاعدے کی مثال تحریر کرتے وقت یہ علامت اس وقت لاتے ہیں جب "مثلاً" یا "جیسے" نہ لکھا گیا ہو۔

(۱) صفت وہ کلمہ ہے جس سے کسی اسم کی اچھائی یا برائی کا اظہار ہوتا ہو:۔ کالا، گندہ، موٹا، خوب صورت۔

(۲) ملک کی صنعتی ترقی اور خوش حالی کا انحصار اس کے طول و عرض پر منحصر نہیں ہے:۔ جاپان کو ہی دیکھئے۔

۵۔ ختمہ (۔)

جن زبانوں میں حروف منقوط کی کثرت نہیں ہوتی ان میں جملہ مکمل ہونے پر ڈیش کے بجائے نقطہ لاتے ہیں جیسے انگریزی زبان میں Full stop کہتے ہیں مگر جن زبانوں میں حروف منقوط کی کثرت ہوتی ہے جیسے اردو اور فارسی ان میں جملہ کے اختتام پر نقطہ کے بجائے

چھوٹا سا ڈیش (-) لگاتے ہیں اسے "ختمہ" کہتے ہیں۔ ختمہ کی علامت جملہ کے مکمل ہونے اور قاری کے لئے بھرپور ٹھہراؤ کی نشان دہی کرتا ہے۔ مثلاً

(۱) ہر اچھا شہری اپنے ملک کا وفادار ہوتا ہے۔ (۲) ہم اپنے حقوق کی مانگ اسی وقت کر سکتے ہیں جب اپنے فرائض کو اچھی طرح انجام دیں۔

۲۔ انگریزی کے مخففات (Abbreviations) کے درمیان ختمہ کی علامت لگاتے ہیں۔

جیسے :- (۱) پی۔ جی۔ ٹی (اردو)

(۲) ایس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی۔

جب ایک سے زیادہ مخففات ایک ہی سلسلہ میں لکھے جاتے ہیں تو ہر مخفف کے بعد سکتہ کی علامت لگانی ضروری ہوتی ہے۔ جیسے

ڈاکٹر محمد اقبال۔ ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی، بیرسٹر ایٹ لا۔

عربی کے مخففات کے بعد عموماً ختمہ کی علامت نہیں لگاتے بلکہ اس کے لئے متعینہ مخفف حروف اس طرح لکھ دیئے جاتے ہیں :

حضرت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم)، حضرت خضرؑ (علیہ السلام)، حضرت عمر فاروقؓ (رضی اللہ عنہ)، حضرت نظام الدین اولیاءؒ (رحمۃ اللہ علیہ)۔

۶۔ ندائیہ، فجائیہ (!) Sign of exclamation

ندا کے معنی آواز دینا۔ جس کو آواز دے کر مخاطب کیا جاتا ہے اسے منادیٰ کہتے ہیں۔ وہ کلمات جو کسی کو مخاطب کرنے یا بلانے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں "حروف ندا" کہلاتے ہیں جیسے او! ارے! اے! صاحبو! وغیرہ۔ مخاطب کرنے والے الفاظ کے آگے ندائیہ علامت (!) لگائی جاتی ہے :-

اے بلبل ہزار داستاں !، اے میری طوطیٔ شیوہ بیاں !، حضرات !، محترم سامعین! سنئے جناب !، دوستو !، پیارے بچو !، بھائیو اور بہنو ! لوگو !۔

یہ یاد رکھئے کہ جب منادیٰ جمع کی حالت میں استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے آخر کا

"ن" گرا دیتے ہیں جیسا کہ اوپر کی مثالوں میں لکھا ہوا ہے۔

فجائیہ:- خوشی، غمی، تعجب، خوف، نفرت یا اسی طرح کے دوسرے مختلف جذبات و تاثرات کے اظہار کے لئے الگ الگ الفاظ ہیں ان کو "حروف فجائیہ" کہتے ہیں۔ ان الفاظ کے بعد بھی وہی علامت لگائی جاتی ہے جو ندائیہ کی ہے۔ مثلاً آہاہا! ، ہائے!، افسوس!، وائے!، سبحان اللہ!، بہت خوب!، تف!

جذبے کی شدت کے لحاظ سے ایک سے زائد بھی فجائیہ نشان لگا دیتے ہیں جیسے بس صاحب! بس!!

برج بانو مسکرا رہی ہے اور میں قلفی والے کے الفاظ زیر لب دہرا رہا ہوں:

لاجواب! شاندار!! بے نظیر!!!

۷۔ سوالیہ (؟) Sign of interrogation

یہ علامت سوالیہ جملہ کے بعد لگاتے ہیں اور تم جانتے ہی ہو کہ سوالیہ جملے حروف استفہام سے بنتے ہیں، اس لئے کب، کیوں، کیسے، کہاں، کس طرح، کون وغیرہ سے بننے والے جملوں کے آخر میں سوالیہ نشان (؟) لگائے جاتے ہیں۔ جیسے کون آیا؟ کہاں جا رہے ہو؟ تم کب پڑھوگے؟ ہم کیسے لکھیں؟ کیا یہی تمہاری تہذیب ہے؟۔

۸۔ خط (—) Dash

Dash کے لئے اردو میں "خط" اور Fullstop کے لئے "ختمہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اگرچہ دونوں کے لئے اردو میں ڈیش کا ہی استعمال ہوتا ہے لیکن ختمہ یعنی Fullstop کے مقابلہ میں Dash کا خط بڑا ہوتا ہے۔

ا کسی سابقہ لفظ کی تشریح کرنے کے خیال سے جب کئی لفظوں کا استعمال کیا جاتا ہے تو درمیان میں خط کی علامت آتی ہے۔

انوار — نہ صرف انوار بلکہ اس کا پورا خاندان — اس حادثہ کا شکار ہوگیا۔

(۲) گھر کا سارا سامان ــــ گہنے ، زیور ــــ کپڑے ، لتے ــــ میز، کرسیاں ــــ سب ہی کچھ تو چوری ہو گیا ــــ

۲ جملہ معترضہ سے پہلے اور اس کے بعد میں اکثر اس علامت کا استعمال کیا جاتا ہے ۔

(۱) میری خوشی ــــ تعجب ہے ! تمہیں میری خوشی کا خیال کب سے ہو گیا ــــ میں کیا اور میری خوشی کیا ــــ ؟

۹ ۔ قوسین ( ) Brackets

خط کی طرح قوسین کی علامتیں بھی جملہ معترضہ کے پہلے اور آخر میں لگائی جاتی ہیں ۔ لکھنے والے کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس موقع پر قوسین کا استعمال کرتا ہے یا خط کا ــ جیسے

(۱) میری گھڑی (جو تم نے شادی کے موقع پر دی تھی) کل کسی نے چوری کر لی ۔

(۲) مسعودہ حیات صاحبہ (اردو کی مشہور شاعرہ) کو اردو اکادمی کا ایوارڈ عطا کیا گیا ہے ۔

(۳) میں نے دہلی کی تمام تاریخی عمارتوں کی (ہمایوں کے مقبرہ کے علاوہ) سیر کر لی ہے

قوسین کے استعمال میں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ ان کے بے موقع استعمال سے عبارت بے ربط نہ ہو جائے ۔ مثلاً مذکورہ بالا تینوں جملوں کے درمیان بریکٹ اس طرح لگائیں تو عبارت بے ربط ہو جائے گی :۔ (۱) میری گھڑی کل (جو تم نے شادی کے موقع پر دی تھی) کسی نے چوری کر لی ۔

(۲) مسعودہ حیات صاحبہ کو (اردو کی مشہور شاعرہ) اردو اکادمی کا ایوارڈ عطا کیا گیا ہے ۔

(۳) میں نے دہلی کی تمام تاریخی عمارتوں (ہمایوں کے مقبرہ کے علاوہ) کی سیر کر لی ہے ۔

۱۰ ۔ واوین (" ") Inverted Commas

واوین کی علامت حسب ذیل موقعوں پر لاتے ہیں :۔

(۱) جب کسی کے قول کو اسی کے الفاظ میں لکھنا ہوتا ہے ، تو اس عبارت سے پہلے اور آخر میں واوین لگاتے ہیں اس طرح یہ عبارت باقی عبارت سے الگ ہو کر پڑھنے والوں کے لئے

مخصوص توجہ کا باعث بن جاتی ہے۔

غالب اپنے خطوط کے سلسلہ میں خود تحریر فرماتے ہیں :۔

" میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

(۲) نثر کے کسی مخصوص ٹکڑے کو جب اپنی عبارت میں کھپانا ہو تو اس کو ممتاز کرنے کے لئے اس کے اول و آخر میں واوین لگاتے ہیں۔

(۳) جب کسی مشہور شعر کے ایک مصرعہ، کسی خاص ترکیب لفظی، نثر کے کسی مخصوص ٹکڑے یا لفظ کو اپنی عبارت میں لانا ہوتا ہے تو اس کو واوین سے گھیر دیتے ہیں۔ کچھ خاص اصطلاحیں اور اس کے معنی کو بھی واوین سے مقید کر کے ان کو نمایاں کیا جاتا ہے۔

واوین لگانے کے سلسلہ میں آپ کو چند اصول بتائے گئے ہیں۔ انھیں سمجھنے کے لئے حسب ذیل مثالوں کو بغور پڑھئے :۔

۱۔ حالی نے مرزا غالب کو "حیوانِ ظریف" کہا ہے۔

۲۔ اردو کو ختم کرنے والے متعصب اور تنگ نظر افراد یہ ذہن نشین کرلیں:

ع۔ "پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا"

۳۔ پہلے کے لوگ "میں نے" کو "مینے" لکھا کرتے تھے۔ اس طرح لکھنے کو اب غلط سمجھا جاتا ہے

۴۔ شبلی نعمانی نے اعظم گڑھ میں "دار المصنفین" کی بنیاد رکھی۔

۵۔ "محاکات" کے معنی ہیں "کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا کہ اس شے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے"۔

۶۔ علم عروض کی اصطلاح میں، شعر کے اجزا کو بحر کے ارکان پر وزن کرنے کا نام "تقطیع" ہے۔ اس کے اصل معنی ہیں "پارہ پارہ کرنا"۔

فنِ خطاطی اور اس کی قسمیں

خطاطی اردو رسم الخط اور خوش نویسی کا اعلا نمونہ ہے جو ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بات سے سب ہی محبانِ اردو متفق ہیں کہ اردو زبان صرف اپنے رسم الخط کی وجہ سے ہی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ایسی صورت میں ہم اردو والوں پر نہ صرف اس کے رسم الخط کو ہی برقرار رکھنے کی ذمہ داری ہے بلکہ اس سے متعلق عام اصول و قواعد نیز فن خوش نویسی کو بھی زندہ رکھنا ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج کا اردو داں طبقہ ان سے آہستہ آہستہ نابلد ہوتا جا رہا ہے۔ اگر یہی حالات رہے تو آئندہ ساٹھ ستّر سالوں میں اردو رسم الخط کے اعلا نمونوں اور فن خطاطی کے ناموں سے لوگوں کے کان بھی نا آشنا ہو جائیں گے۔

اردو ادب اور اس کے درسی اسباق میں فن خطاطی سے متعلق مختلف خطوط کے نام کبھی تشبیہہ، کبھی استعارے تو کبھی صرف "تذکرے" کی صورت میں آتے رہتے ہیں مثلاً:۔

عطارد کو آنے لگی اس کی ریس	ہوا سادہ لوح میں وہ خوش نویس
ہوا جب کہ نو خط و شیریں رقم	بڑھا کر لکھے سات سے نو قلم
لیا ہاتھ جب خامۂ مشکبار	لکھا نسخ و ریحاں و خطِ غبار
عروس الخطوط اور ثلث و رقاع	خفی اور جلی مثل خطِ شعاع

("مثنوی سحر البیان")

ان خطوط کے بارے میں عام طور سے ہم اساتذہ طلبہ کو پوری معلومات فراہم نہیں کرتے، ان کی ادبی حیثیت اور طلبہ کی معلومات کے خیال سے فنِ خطاطی اور اس کے اقسام سے متعلق چند خاص خاص باتیں ذیل میں تحریر کی گئی ہیں اس کا مقصد

محض طلبہ کو خطوط اور ان کی خصوصیات سے مختصراً روشناس کرانا ہے نہ کہ انھیں فنِ خطاطی سکھانا۔

خوش نویسی دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح ایک قدیم اور دلچسپ فن ہے اور اس کو "فنِ خطاطی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عہدِ وسطیٰ میں یہ فن سیکڑوں سال تک عرب و عجم اور مسلم دورِ حکومت میں ہندوستان کے اندر عروج پذیر رہا مگر بدلتے ہوئے حالات کے تحت اب تیزی سے روبہ زوال ہے کیونکہ اساتذۂ فن نے اس کو ایک مخصوص دائرے تک ہی محدود رکھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس فن کے قدرداں بھی کم ہوتے گئے یہاں تک کہ اس فن کو بالائے طاق رکھ کر صرف "صاف نویسی" پر اکتفا کر بیٹھے اور اسی کو پیشے کے طور پر اپنا لیا۔ فنِ خطاطی پر کچھ اچھی کتابیں شائع ہوئیں ہیں مگر وہ اب آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔

آپ یہ جانتے ہی ہیں کہ اردو زبان دیگر زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کا مرکب ہے۔ اردو کی تحریری صورت خطِ فارسی یعنی نستعلیق ہے۔ اس رسم الخط میں زمانہ کے ساتھ ساتھ نئے نئے تجربات ہوتے رہے یہاں تک کہ فنِ خوش نویسی نئے نئے روپ اور نئے نئے خطوط میں ظاہر ہوا جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ چونکہ فنِ خطاطی کا تمام تر انحصار حروفِ تہجی کی بناوٹ اور اس کی ملاوٹ پر ہے اس لئے خوش نویسی کے مختلف خطوط کے بارے میں بتانے سے پہلے اردو کے حروفِ تہجی کے سلسلہ میں عرض کر دوں کہ "نکاتِ نستعلیق" میں وحید ارشد نے ان کی کل تعداد ۳۸ لکھی ہے۔ ان میں ھ، ء بھی شامل ہیں۔ اردو کے حروفِ تہجی میں عربی کے ۳۱، فارسی کے ۴ (پ، چ، ژ، گ) اور ہندی کے ۳ (ٹ، ڈ، ڑ) حروف شامل ہیں۔ کل حروفِ تہجی میں بے نقط حروف کی تعداد ۱۸ ہے۔ متشابہ حروف یعنی جن کی بناوٹ ایک جیسی ہے وہ ۲۸ ہیں۔ بعض حروف ایسے ہیں جو دوسرے حروف سے نہیں جڑتے اگر وہ لفظ کے شروع میں آئیں تو الگ رہیں، درمیان میں آئیں تو لفظ کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیں اور اگر آخر میں آئیں تو ان کی شکل بدل جائے ایسے حروف کو "حروفِ

مفرد" کہتے ہیں جو تعداد میں ۹ ہیں (ا ، د ، ڈ ، ذ ، ر ، ڑ ، ز ، ژ ، و) جفت حروف کی تعداد ۲۷ ہے جو ایک دوسرے سے منسلک ہو کر لفظ بناتے ہیں۔ (نکاتِ نستعلیق)

خطِ نستعلیق کی ایجاد :- ابتدائے اسلام میں عراق، حجاز اور عرب میں کوفی و عبرانی زبانیں اور ان کے رسم الخط رائج تھے۔ ابن مقلہ نے انہیں سے ۳۱۰ھ میں عربی یا "خطِ نسخ" کی ایجاد کی اور حسن نامی ایک شخص نے ۳۲۲ھ میں خطِ کوفی سے "خط تعلیق" کی ایجاد کی۔ ابتدا میں یہی دونوں خطوط یعنی "خط نسخ" اور "خط تعلیق" کچھ عرصہ تک ایران میں رائج رہے۔ ساتویں صدی ہجری میں ایران کے شاعر میر علی تبریزی نے "خط نسخ" اور "خط تعلیق" کو ملا کر "خط نستعلیق" (نسخ + تعلیق) کی ایجاد کی۔ یہ خط ایسا مقبول ہوا کہ شاغل عثمانی نے اپنی کتاب "صحیفۂ خوش نویساں" میں اس کو "احسن الخطوط" اور "عروس الخط" کہلانے کا مستحق قرار دیا ہے۔ اگرچہ دوسرے خطوط جن کا ذکر بعد میں آئے گا اپنی اپنی انفرادیت اور دلکشی کے لئے مشہور ہیں مگر "خط نستعلیق" کی بات ہی کچھ اور ہے اس کی مقبولیت اور وسعت کے مقابلہ میں دوسرے خطوط اس مرتبہ کو نہ پہنچ سکے۔

خط نستعلیق میں چرند و پرند کے علاوہ اعضائے انسانی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ چونکہ "خطِ نستعلیق" کی ایجاد سورماؤں کے ملک ایران میں ہوئی اس لئے اس کی بناوٹ میں تلوار کا خم، بھالے کی نوک اور خنجر کی دھار نظر آتی ہے۔ چونکہ فنِ خطاطی کے بیشتر خطوط عربی رسم الخط سے ایجاد ہوئے ہیں اس لئے عربی رسم الخط کو "مادرِ خطوط" کہا جاتا ہے۔ حسب ذیل خطوط ابن مقلہ کے ایجاد کردہ ہیں :-

۱۔ خطِ ثلث :- (ثلث = ایک تہائی) جس نے "خط ثلث" کو سیکھ لیا گویا اس نے فنِ خطاطی کا ایک تہائی حصہ سیکھ لیا۔ اسی لئے اس کو "خطِ ثلث" کہا جاتا ہے۔

۲۔ خطِ نسخ :- اس خط کے ایجاد کے بعد چونکہ پہلے کے تمام خطوط منسوخ ہو گئے اس لئے معنی کے اعتبار سے اس کو "خطِ نسخ" کہا گیا۔

۳۔ خط توقیع :- توقیع کے معنی ہیں "شاہی فرمان"۔ چونکہ شاہی فرمان اسی خط میں لکھے جاتے تھے اس لئے اس کو خطِ توقیع کے نام سے پکارا گیا۔

۴۔ خطِ ریحان :۔ ریحان ایک خوبصورت اور خوش بو دار پھول کا نام ہے۔ چونکہ یہ خط خوب صورتی میں ریحان کی نزاکت و نفاست رکھتا ہے۔ اس لئے اس کو "خطِ ریحان" کہتے ہیں۔

۵۔ خطِ محقق :۔ اس خط کے دائروں کی بناوٹ و پیمائش میں پوری تحقیق سے کام لیا جاتا ہے اس لئے معنوی مناسبت کے لحاظ سے اس کو "خطِ محقق" کہتے ہیں۔

۶۔ خطِ رقاع :۔ (رقعہ کی جمع ہے "رقاع") دفاتر کے حساب کتاب اور رقعہ جات اسی خط میں لکھے جاتے تھے۔ اس لئے اس کو "خطِ رقاع" کہتے ہیں۔

ابن مقلہ کے مذکورہ بالا چھے خطوط کے علاوہ بھی کچھ خطوط دوسروں نے ایجاد کئے جن کے نام حسب ذیل ہیں :۔

۷۔ خطِ تعلیق یا خطِ دیوانی :۔ اس خط کے حروف ایک دوسرے سے اس طرح ملے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کے الفاظ کو بدلا نہیں جا سکتا اس لئے فرمان اور مراسلات کے لئے اسی خط کا انتخاب کیا گیا۔

۸۔ خطِ نستعلیق :۔ یہ "خطِ نسخ" اور "خطِ تعلیق" سے بنا ہوا خط ہے اس کے معنی "خط تعلیق" کو منسوخ کرنے والا خط بھی لیا جاتا ہے (اس کے متعلق پہلے ہی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے)۔

۹۔ خطِ شکستہ :۔ اس خط کو "خطِ شکستہ" اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک قسم کی شکستگی پائی جاتی ہے اس کا دوسرا نام "خطِ دیوانی" بھی ہے کیونکہ تیز رفتاری سے لکھنے کے لئے عدالتوں نیز دوسرے دفاتر میں اسی خط کا استعمال کیا جاتا تھا "خطِ تعلیق" اور "نستعلیق" کو ملا کر یہ خط ایجاد کیا گیا پھر رفتہ رفتہ اس کے اصول و ضوابط متعین کئے گئے۔

۱۰۔ خطِ شفیعہ :۔ یہ خط شکستہ ہی کے ایک مخصوص طرز کا نام ہے۔ مرزا شفیعائی جو اس خط کے استاد مانے جاتے ہیں انھیں کے نام پر یہ خط مشہور ہے۔

خطِ مصنوعہ

بعض خوش نویسوں نے قلمی صناعی، مصوری اور نقاشی کے ایسے ایسے نمونے پیش کئے کہ وہ اپنی صناعی کے باعث "خطِ مصنوعہ" کے نام سے مشہور ہوئے۔ مثلاً:-

۱۔ خطِ گلزار:- اس خط کی خوبی یہ ہے کہ پہلے بہت ہی باریک لکیروں سے حروف کی حد بندی کر دی جاتی ہے جس کے درمیان کا حصہ خالی رہتا ہے پھر ان خالی جگہوں میں پھول، پتے، بیل بوٹے اور آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دی جاتی ہیں جس کی وجہ سے یہ گلزار معلوم ہوتے ہیں۔

۲۔ خطِ غبار:- حروف جلی کے درمیان بہت باریک لفظوں یا عبارت کو اسی طرح لکھا جاتا ہے کہ وہ غبار کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ اس لئے اس کو خطِ غبار کہتے ہیں۔

۳۔ خطِ ماہی:- چونکہ یہ خط ماہی سے مناسبت رکھتا ہے اس لئے اس کو خطِ ماہی کہتے ہیں۔ خطِ گلزار کی طرح اس میں پہلے باریک لکیروں سے حروف کی حد بندی کر دی جاتی ہے پھر حروف کے درمیانی حصہ میں جو سادہ ہوتا ہے اس میں باریک لفظوں یا تحریر کے ذریعہ مچھلی کی شکل اس طرح بنا دی جاتی ہے کہ موٹے حصہ کی طرف سر اور پتلے حصہ کی طرف اس کی دم ہوتی ہے۔

۴۔ خطِ تغرا:- آج بھی طغرے اسی خط میں لکھے جاتے ہیں۔ اس میں حروف ایک دوسرے سے ملا کر اس طرح لکھے جاتے ہیں کہ انسان، جانور، پرندے یا کسی عمارت (عموماً مسجد) کی شکل ابھر کر نظر آتی ہے۔ خوش نویسی کے اصول و قواعد سے ہٹ کر اس میں زائد خطوط یا نقطے لگائے جا سکتے ہیں۔

۵۔ خطِ مقابل یا خطِ معکوس:- اس میں اصل لفظ کو سیدھے لکھ کر وہی الفاظ اس کے مقابل یا الٹے لکھے جاتے ہیں مگر اس بات کا دھیان رکھنا ہوتا ہے کہ الٹے حروف بالکل اصل کے مطابق ہوں تاکہ ان کا عکس بالکل اصل کے مطابق ہو۔

۶۔ خطِ توام :۔ (توام کے معنی "جوڑواں بچے") یہ خط دو باریک کاغذوں پر الگ الگ اس طرح لکھا جاتا ہے کہ حروف کا ایک حصہ ایک کاغذ پر سیدھا دوسرا حصہ دوسرے کاغذ پر الٹا ہو۔ ان صفحات کو اگر الگ الگ دیکھا جائے تو عبارت سمجھ میں نہیں آتی مگر جب دونوں صفحات کو ملا کر پڑھا جائے تو عبارت بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے۔

ذیل میں خطوط کے اعتبار سے فنِ خطاطی کے کچھ نمونے پیش کئے جارہے ہیں۔

خطِ ثلث

عَاتِبْ أَخَاكَ بِالْإِحْسَانِ إِلَيْهِ وَارْدُدْ شَرَّهُ بِالْإِنْعَامِ عَلَيْهِ

خط نسخ

زِيَادَةُ الْعَقْلِ عَلَى اللِّسَانِ نِعْمَةٌ وَفَضِيلَةٌ وَزِيَادَةُ اللِّسَانِ عَلَى الْعَقْلِ بَلِيَّةٌ وَرَذِيلَةٌ

خط فارسی

من سامح الايام طابت حياته وقلت احزانه ونعم باله

خط ریحان

استقلال الارادة والاكباب على العلوم والمعارف هما عاملان قويان في رقي النشئ يضمان له النجح

خط رقعہ

لا شئ امن من الحرية ولا سعادة اكبر من القيام بالواجب

خط دیوانی جلی

احترم الضعيف اذ يكون تحت راية العدل والانصاف اكثر من القوي اذ يكون تحت راية الظلم

خط دیوانی

من استبد برأيه ضل ومن استعان بذوي العقول فقد سلك سبيل الارشاد

خط کوفی

فضل العاقل على الجاهل
كفضل النجم على السها

فضل العاقل علی الجاہل   کفضل النجم علی السُہا   (راقم خلیق ٹونکی)

فتبارک اللہ احسن الخالقین
والحمد للہ رب العالمین
خط گلزار
خط غبار قسم اول
خط غبار قسم دوم
خط ماہی
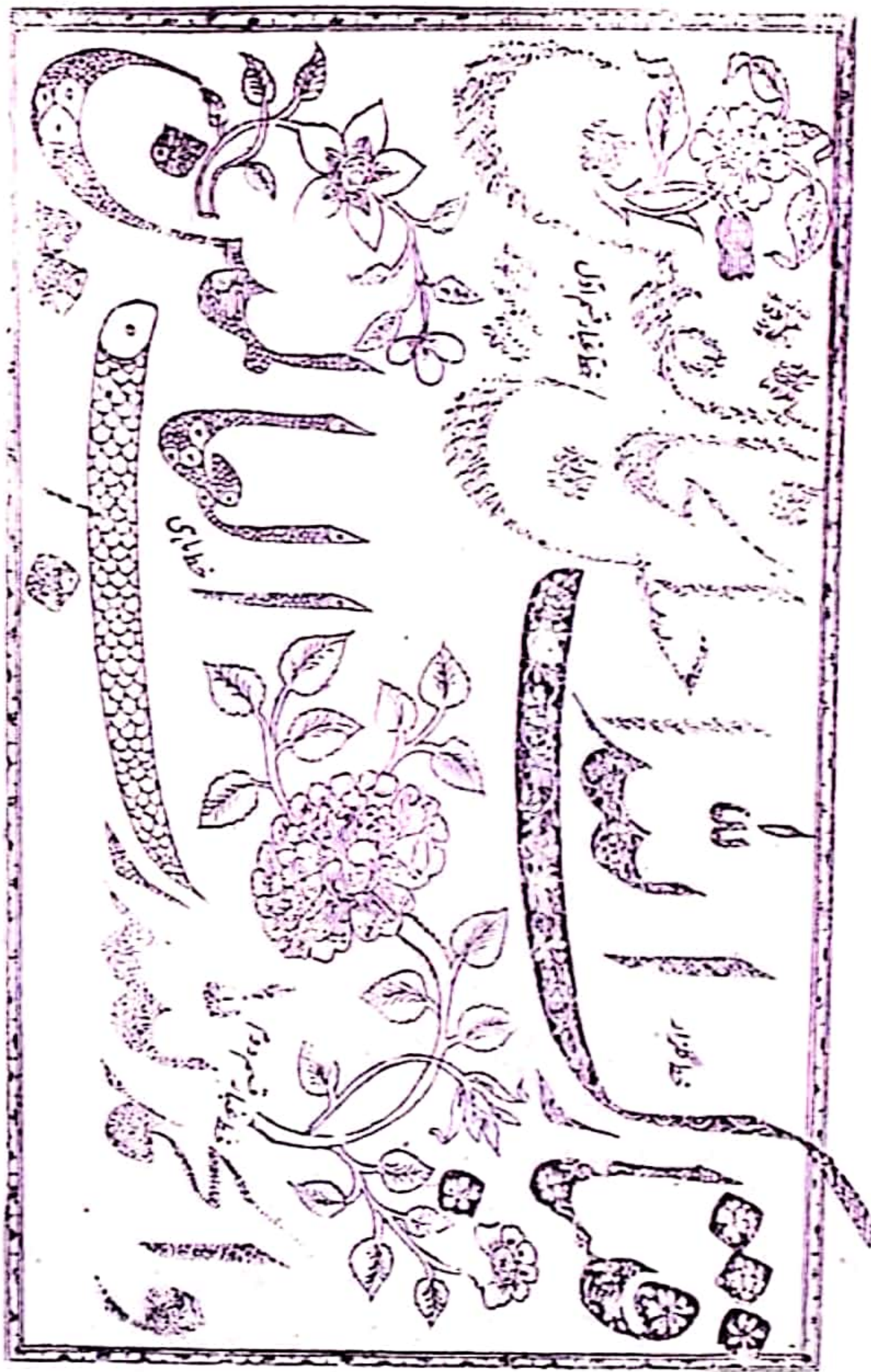
مضمون نویسی

اور اس کے اصول و آداب

کسی موضوع کو ذہن میں رکھ کر اس کے متعلق اپنے خیالات کو آسان، خوبصورت اور موزوں الفاظ میں اس طرح تسلسل کے ساتھ بیان کرنا کہ پڑھنے والا اس کو بخوبی سمجھ جائے، "مضمون نویسی" کہلاتا ہے۔ مضمون نویسی بھی ایک فن ہے۔ اچھا مضمون نگار بننے کے لئے ذخیرۂ معلومات و خزانۂ الفاظ کے ساتھ ساتھ وسیع مطالعہ اور بار بار لکھنے کی مشق کرنی ضروری ہے۔ مطالعہ سے نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ انشاءپردازی کے اسلوب سے واقفیت ہوتی ہے۔ مضمون نویسی میں مہارت حاصل کرنے کے لئے چند خاص خاص باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:۔

۱۔ مضمون لکھنے سے پہلے اس موضوع کے تمام اہم پہلوؤں کا ایک خاکہ ذہن میں بنالیا جائے جس پر مضمون لکھنا ہے۔ یعنی مضمون کی تمہید کیا ہو، کون کون سی باتیں کس کس ترتیب سے لکھی جائیں وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ اپنے خیالات کو ادا کرنے کے لئے آسان، پُراثر اور صحیح زبان کا استعمال کرنا چاہئیے۔

۳۔ تحریر میں الجھاؤ، الفاظ کی تکرار اور غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔

۴۔ موضوعِ تحریر میں تسلسل اور ربط مضمون نویسی کی جان ہے۔

۵۔ جس موضوع پر مضمون لکھنا ہو اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات ہونی چاہئے۔ ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے جس سے حکومتِ وقت، کسی جماعت، مذہب یا فرد کی تضحیک ہوتی ہو۔

۶۔ مضمون کو کئی پیراگرافوں میں تقسیم کر کے لکھنا چاہئے۔ پورے مضمون کو ایک پیراگراف میں لکھنا غلط ہے۔

۷۔ پورے مضمون کو لکھ لینے کے بعد اسے ایک بار ضرور دہرا لینا چاہئے۔

مضمون کے تین حصے ہوتے ہیں :۔ (ہر حصے کو نئے پیراگراف سے شروع کرنا چاہئے)

۱۔ تمہید ۲۔ نفسِ مضمون ۳۔ اختتام

۱:۔ تمہید مضمون کا اہم اور پہلا حصہ ہے ۔ اس میں اصل موضوع یا نفسِ مضمون سے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے چند پُر اثر اور زور دار جملے اس طرح کے لکھے جاتے ہیں جس سے پڑھنے والوں کے ذہن اصل موضوع کی طرف راغب ہوں اور ان کی دلچسپی بھی بڑھے ۔

۲ :۔ مضمون کا درمیانی حصہ نفسِ مضمون کہلاتا ہے جس میں موضوع کے متعلق تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے ۔ چونکہ یہ حصہ طویل ہوتا ہے اس لئے اس کو کئی پیراگرافوں میں تقسیم کر کے لکھنا چاہئے ۔

۳:۔ مضمون کا آخری حصہ اختتام کہلاتا ہے ۔ اس میں مضمون نگار کو اپنے خیالات کا نچوڑ پُر اثر انداز میں لکھنا ہوتا ہے تاکہ پڑھنے والا متاثر ہو اور آسانی کے ساتھ مضمون کے موضوع پر اپنی رائے قائم کر سکے یا اس سے کچھ نتیجہ اخذ کر سکے ۔

مضامین تین طرح کے ہوتے ہیں :۔

۱ ۔ بیانیہ مضامین

۲ ۔ حکائیہ مضامین

۳ ۔ فکری مضامین

۱۔ بیانیہ مضامین :۔ وہ مضامین جن میں کسی شخص ، عمارت یا کسی جاندار کا مفصل ذکر کیا جائے جیسے " تاج محل " ۔ " جواہر لال نہرو " اور " گائے " وغیرہ ۔

۲۔ حکائیہ مضامین :۔ وہ مضامین جن میں کسی واقعہ ، کہانی ، تفریح یا سفر کے حالات وغیرہ بیان کئے گئے ہوں ۔ جیسے " میری زندگی کا ایک اہم دن " " یومِ آزادی " " میرا دلچسپ سفر " " میرا پسندیدہ کھیل " " ریل کا حادثہ " وغیرہ ۔

۳ ۔ فکری مضامین :۔ وہ مضامین جن کی بنیاد تمام تر خیالات اور افکار پر ہوتی ہے ۔ مثلاً " چاندنی رات " " اگر میں وزیر اعظم ہوتا " " وقت کی قیمت " وغیرہ ۔

ذیل میں نمونے کے طور پر چند مضامین کے اشارے لکھے گئے ہیں مضمون شروع کرنے سے پہلے آپ بھی اپنے مضمون کے لئے اس کے موضوع کے اعتبار سے چند ضروری اشارے متعین کر لیجئے۔

۱۔ جانوروں کی بابت :- (۱) قسم (۲) جسم کے حصّے اور ان کی خصوصیات۔
(۳) عادات (۴) خوراک (۵) رہائش (۶) فوائد و نقصانات۔

۲۔ موسموں کے متعلق :- (۱) تمہید (۲) وقت (۳) خصوصیات (۴) نباتات اور انسانوں پر اس کا اثر (۵) فوائد و نقصانات (۶) عام رائے۔

۳۔ سائنسی ایجادات کے لئے :- (۱) تمہید (۲) عوام میں اس کا استعمال (۳) موجد (۴) اس کی ایجاد سے پہلے کا طریقہ کار (۵) فوائد و نقصانات (۶) عام تاثر

۴۔ کھیلوں کے متعلق :- (۱) تمہید (۲) اس کھیل کی ایجاد کب اور کہاں ہوئی۔
(۳) کھیلنے والوں کی تعداد (۴) سامان کھیل (۵) کھیل کا طریقہ اور جگہ (۶) صحت پر اثر۔
(۷) کھیل کی مقبولیت (۸) فوائد اور نقصانات۔

۵۔ کسی شخص کے متعلق :- (۱) تمہید (۲) نام، ولدیت اور خاندان (۳) مقام پیدائش، تاریخ پیدائش (۴) تعلیم و تربیت (۵) اہم کارنامے (۶) اس کی ذات سے ملک یا سوسائٹی کو فائدہ (۷) عادات (۸) وفات (۹) یادگار۔

۶۔ تہوار کے لئے :- (۱) کس قوم کا اور کس نوعیت کا تہوار ہے یعنی مذہبی، سماجی یا قومی (۲) کب منایا جاتا ہے۔ (۳) کیوں منایا جاتا ہے (۴) کس طرح منایا جاتا ہے (۵) اس کے اچھے اور برے پہلو (۶) برے پہلوؤں کے سدھار کا طریقہ۔

نوٹ :- عموماً طلبہ چند لائنیں لکھ کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے مضمون مکمل کر لیا۔ اس طرح وہ امتحان کے موقع پر اچھے نمبروں سے محروم رہ جاتے ہیں چھٹی تا بارہویں جماعت کے طلبہ کے لئے لازم ہے کہ وہ جماعت کے اعتبار سے اپنے مضمون کی زبان، اندازِ تحریر، دلائل مضمون کی جسامت، مثالیں اور نفسِ مضمون کے معیار کا خیال رکھیں۔

جماعت کے اعتبار سے امتحان میں سَو سے لے کر تین سَو الفاظ تک مضامین لکھنے کے لئے آتے ہیں مضمون لکھنے کے بعد ان کو گننا وقت ضائع کرنا ہے۔ اگر آپ نے ہر لائن پر مضمون لکھا ہے تو سَو الفاظ والے مضمون کے لئے امتحان کی کاپی کا ایک صفحہ کافی ہے۔

اردو زبان

زبان کوئی بھی ہو اس کی نشو و نما اور فروغ کے لیے صدہا سال کی مدت درکار ہوتی ہے اور اس کی مقبولیت نیز ہردلعزیزی کا اندازہ اس کی جغرافیائی وسعت اور ادبی ذخائر سے کیا جاتا ہے۔ یوں تو اردو زبان کی کل عمر تقریباً ایک ہزار سال ہے لیکن اس نے صرف تین سو سال کی قلیل مدت میں اپنی مقبولیت اور وسعتِ زبان کا لوہا منوا لیا اس دعوے کی دلیل میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اردو زبان کشمیر سے کنیا کماری اور سندھ سے آسام تک بولی اور سمجھی جاتی ہے اردو اخبارات و رسائل کی کثیر اشاعت، ٹی۔ وی اور ریڈیو کے اردو پروگرام، فلموں کے گانے و مکالمے اور مشاعروں کے اہتمام اردو زبان کی مقبولیت کے بیّن ثبوت ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والا یہ جانتا ہے کہ اردو زبان کا جنم ہندوستان میں ہوا۔ یہیں پلی بڑھی اور پھلی پھولی۔ اردو زبان نہ تو محلات میں پیدا ہوئی اور نہ ہی کسی مخصوص طبقہ اور مذہب کی زبان رہی بلکہ اس نے عوام کے درمیان فوجی چھاؤنیوں میں جنم لیا اور عوام نے ہی اس کو بام عروج پر پہنچا کر مقبولیت کا تاج بخشا۔

اس کی تاریخ کے سلسلہ میں چند لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شمال و مغرب کے راستوں سے مسلمانوں کے جو لشکر آئے انھوں نے فاتح کی حیثیت سے دہلی کو پایہ تخت بنایا۔ ان کی زبان عربی، فارسی یا ترکی تھی جب کہ دہلی اور اس کے قرب و جوار کے رہنے والے برج بھاشا، کھڑی بولی یا پنجابی بولتے تھے۔ فوج میں دیس بدیس کے لوگوں کے ایک ساتھ رہنے سہنے اور لین دین کی وجہ سے ایک دوسرے کی زبان کے الفاظ بول چال میں شامل ہونے لگے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ایک نئی زبان وجود میں آئی جس کو "اردو" کے نام سے پکارا گیا۔ اردو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "لشکر"۔ اردو نے دہلی کے گرد و نواح میں بولی جانے والی برج بھاشا کا اثر سب سے زیادہ قبول کیا۔ اسی وجہ سے اردو کو برج بھاشا کی بیٹی

کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اردو میں بہت سی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں مثلاً عربی، فارسی، کھڑی بولی، پنجابی، ترکی، انگریزی اور پرتگالی وغیرہ۔ شاہجہاں کے دور سے اردو زبان تیزی کے ساتھ پروان چڑھنے لگی یہاں تک تین سو سال کی مختصر مدت میں ترقی کی تمام منزلیں طے کرکے اس نے اپنی مقبولیت کا سکہ جما لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج نظم و نثر کے سب ہی اصناف سے دامنِ اردو معمور ہے۔ اردو زبان کو فروغ دینے میں کسی ایک فرد، جماعت یا طبقہ کا ہاتھ نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے ہر مذہب و ملت کے لوگوں نے اس شجر کی آبیاری کی ہے۔ اردو زبان کو ترقی دینے میں فورٹ ولیم کالج کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ کہنا کہ اردو بیرونی یا مسلمانوں کی زبان ہے سراسر غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، پریم چند، برج نرائن چکبست، رگھوپتی سہائے فراق، راجندر سنگھ بیدی، اور کرشن چند وغیرہ جیسے نامور شعراء و ادبا اردو زبان کے چاند تارے بن کر نہ چمکتے ـــ یہ صحیح ہے کہ ابتدا میں اردو زبان صرف بول چال تک محدود رہی کیونکہ شمالی ہند کے پڑھے لکھے لوگوں کی زبان فارسی تھی وہ اسی زبان میں شعر و شاعری اور خط و کتابت کرنا پسند کرتے تھے۔ لیکن تاجروں اور اراکین سلطنت کی آمد و رفت کے ذریعہ جب اردو زبان جنوبی ہند پہنچی تو وہاں مسلم ریاستوں کا سہارا پاکر رفتہ رفتہ ادبی حیثیت اختیار کرنے لگی۔ شاعر اور نثر نگار پیدا ہونے لگے۔ اردو کے سب سے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ولیؔ دکنی کو اردو شاعری کا بابا آدم کہا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو کا جنم شمالی ہند میں ہوا اور اس کی پرورش جنوبی ہند میں ہوئی مگر اس کو شباب پھر شمالی ہند میں آکر ہی نصیب ہوا۔ دلی اور لکھنؤ اردو زبان کے دو مراکز قرار پائے جہاں میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، انیسؔ، دبیرؔ، آتشؔ، اور ناسخؔ جیسے شعراء اور اردو ادب کے عناصر خمسہ جیسے ادبا پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔

اردو زبان کا رسم الخط عربی فارسی ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ کچھ اردو مخالفین اس کے رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کرنے کی بات کرتے ہیں۔ خدانخواستہ اس ناقص تجویز کو کسی بنا پر میں اگر محبانِ اردو نے قبول کرلیا تو پھر یقین رکھئے کہ اردو زبان اپنا وجود کھو بیٹھے گی۔ گنگا جمنا کی چہیتی، برج بھاشا کی بیٹی اردو زبان پر چند متعصب اور فرقہ پرست افراد کا الزام ہے کہ یہ

ہیروئی اور مسلمانوں کی زبان ہے۔ شاید انہوں نے اردو زبان کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ وہ دیکھتے کہ قمری وبلبل کی چمنستانِ اردو میں چہچہاہٹ کے ساتھ کوئل کی کوکو پپیہے کی پی پی، مور کی پکار اور بھونرے کی گنگناہٹ بھی ہے۔ لالہ وسوسن کے ساتھ چنبیلی، موتیا، لاجونتی اور کنول کے پھول بھی کھلے ہوئے ہیں۔ سرو شمشاد کے پہلو میں جامن، آم اور پیپل بھی اپنی بہار دکھارہے ہیں۔ موسم بہار، وادیٔ ایمن اور کوہ قاف کی پریوں کے علاوہ بسنت، برسات، صبحِ بنارس، شامِ اودھ، ہمالہ اور گوکل کی گوپیوں کے ذکر سے بھی دامنِ اردو گل وگلزار ہے۔ انگریزی زبان کے بہت سے الفاظ اردو میں اس قدر رچ بس گئے ہیں گویا وہ بھی اردو کے ہی الفاظ ہیں مثلاً کوٹ، کالر، الکشن، بسکٹ گلاس، اسٹیشن، ٹکٹ، قلی اور اسکول وغیرہ۔ اردو زبان کی شیرینی، لطافت اور رنگارنگی کا کیا کہنا بقول شاعر: ع "پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر"۔ جیسا نازک خیال ہے تو دوسری طرف "انقلاب زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے دشمن بدحال ہے۔ بدقسمتی سے آزادی کے بعد اردو زبان سیاست کا شکار ہوگئی۔ رہنمائے قوم اور اکابرینِ سلطنت نے اس کی زبوں حالی پر کبھی مگرمچھ کے آنسو بہائے تو کبھی سبز باغ دکھائے۔ وہ اردو مسائل کو سنتے تو ہیں مگر مختلف بہانوں سے اسے التوا میں ڈالتے جارہے ہیں یہی نہیں بلکہ لسانی تعصب رکھنے والے افراد اردو کے سرسبز و تناور درخت کو تعصب کے طوفان اور نفرت کے تھپیڑوں سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں اور گنگا جمنی زبان کو لوح و قلم سے محروم کرنے کے درپے ہیں شاید انہیں یہ معلوم نہیں کہ: ع "پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا"

یومِ جمہوریہ

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے جہاں مختلف قوموں اور مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ ان کے تہوار بھی مختلف قسم کے ہیں۔ کچھ مذہبی تہوار ہیں، تو کچھ موسمی تہوار، لیکن ہمارے ملک میں دو تہوار ایسے ہیں جو نہ مذہبی ہیں اور نہ موسمی بلکہ یہ قومی تہوار ہیں۔ پہلا "یومِ آزادی" یعنی ۱۵ راگست دوسرا "یومِ جمہوریہ" یعنی ۲۶ رجنوری یہ دونوں تہوار ہر ہندوستانی کے تہوار ہیں۔ ان کا تعلق ملکی محبت اور حب الوطنی کے جذبات سے ہے۔

یومِ آزادی اور یومِ جمہوریہ میں فرق ہے ۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد تو ہوگیا لیکن اس وقت آزاد ہندوستان کا اپنا بنایا ہوا کوئی دستور نہیں تھا۔ اس وجہ سے ہم انگریزوں کے بنائے ہوئے پرانے آئین و دستور پر عمل کرنے کے لئے مجبور تھے۔ یہ آئین نہ تو ہماری مرضی کے مطابق تھا اور نہ ہی ہمارے حقوق اور فرائض کو پورا کرتا تھا۔ مگر کیا کرتے مجبوری تھی کیونکہ نئے دستور کا ازسرِ نو تیار کرنا کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ بہرحال آزادی ملنے کے فوراً بعد نئے دستور کی تیاری کا کام شروع ہوگیا اور ڈاکٹر امبیدکر کی نگرانی میں مسلسل دو سالوں تک ماہرینِ قانون اس کام کو کرتے رہے ۔ آخر وہ مبارک گھڑی آگئی اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو ہندوستان میں نئے آئین کا اعلان ہوا۔ اس نئے آئین کے مطابق ہندوستان ایک جمہوری ملک قرار پایا ۔ اسی لئے ۲۶ جنوری کو "یومِ جمہوریہ" کہا جاتا ہے ۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو انگریزوں نے بھارت کو آزادی دیدی تھی مگر ان کے بنائے ہوئے قوانین کے اثر سے ہندوستان ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو مکمل طور پر آزاد ہوا ۔ یہ وہ اہم تاریخ ہے جب ہندوستانی عوام کو اپنا بنایا ہوا قانون ملا، مکمل آزادی ملی، عوام کا راج ہوا، عوام کے لئے ہوا اور ہندوستانی عوام کے ہی ذریعہ ہوا ۔ اسی لئے ۲۶ جنوری "یومِ جمہوریہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہر سال اس قومی تہوار کو نہایت شان و شوکت کے ساتھ منایا جاتا ہے۔

اس دن پورے ملک میں مکمل طور پر چھٹی رہتی ہے ۔ تمام سرکاری عمارتوں پر ہندوستان کا ترنگا جھنڈا لہرایا جاتا ہے ۔ یوں تو ہندوستان کے ہر صوبے کی راجدھانیوں اور بڑے بڑے شہروں میں جشنِ جمہوریہ کا خصوصی پروگرام ہوتا ہے۔ فوجی دستے پریڈ کرتے ہوئے گزرتے ہیں، اسکول کے بچے لیزیم اور فینسی شو وغیرہ کے مظاہرے کرتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے دلِ دہلی کی بات ہی کچھ اور ہے یہ بھارت کی راجدھانی جو ٹھہری ۔ یہاں پر ۲۶ جنوری کا جشن اور اس کی شان و شوکت کا منظر ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ مہینوں پہلے سے اس کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ دور دور سے لوگ اس تقریب کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں، دھکے کھاتے ہیں، بھوکے پیاسے رہتے ہیں، طرح طرح کی پریشانیاں اٹھاتے ہیں مگر واہ رے شوق سارے پروگراموں کو دیکھے بغیر نہیں جاتے۔

انڈیا گیٹ پر صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، وزرا مملکت اور حکام کے علاوہ غیر ممالک سے آنے والے مہمانِ خصوصی موجود ہوتے ہیں۔ وہاں لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے۔ گورنمنٹ کی طرف سے بھیڑ پر قابو پانے اور نظم وضبط کو برقرار رکھنے کے لئے مناسب انتظامات کئے جاتے ہیں۔ جشنِ جمہوریہ کی تقریب کا آغاز راشٹرپتی کی آمد سے ہوتا ہے۔ جیسے ہی وہ بگھی سے اترتے ہیں وہاں پر وزیر اعظم اور دوسرے وزرا ان کا استقبال کرتے ہیں۔ سب سے پہلے بری، بحری، اور ہوائی فوجوں کے دستے باری باری صدر جمہوریہ کو سلامی دیتے ہوئے گذرتے ہیں۔ بعد ازاں بڑے ٹینکوں، توپوں، مشین گنوں اور جدید قسم کے جنگی اسلحوں کا مظاہرہ کیا جاتا ہے تاکہ ہندوستان کی جنگی قوت وطاقت کو دیکھ کر اہلِ وطن کے حوصلے بلند اور دشمنوں کی ہمت پست ہو۔ راشٹرپتی کو اکیس توپوں کی سلامی دی جاتی ہے۔ ہوائی جہازوں کی قطاریں فضا میں پرواز کرتے ہوئے پھولوں کی بارش کرتی ہیں۔ این۔ سی۔ سی اور اے۔ سی۔ سی کے نوجوان اپنی اپنی یونیفارم میں مارچ کرتے ہوئے گزرتے ہیں۔ بہت سے اسکولوں کے لڑکے اور لڑکیاں اپنے دلچسپ پروگراموں سے لوگوں کو محظوظ کرتی ہیں۔

سب سے خوبصورت منظر اُن جھانکیوں کا ہوتا ہے جو ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے آتی ہیں۔ یہ جھانکیاں اپنے اپنے علاقے کی ثقافتی، صنعتی، تاریخی اور معاشرتی جھلک پیش کرتی ہیں۔ انڈیا گیٹ سے لال قلعہ تک جن سڑکوں سے یہ جلوس گزرتا ہے۔ اس کے دونوں طرف دیکھنے والوں کی زبردست بھیڑ ہوتی ہے یہاں تک کہ لوگ بڑی تعداد میں چھتوں اور درختوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ جو لوگ وہاں نہیں پہنچ پاتے وہ ٹی۔ وی پر ۲۶ رجنوری کے پروگراموں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ راشٹرپتی ہر سال ۲۶ رجنوری کو ان لوگوں کو انعامات اور تمغے وغیرہ بھی دیتے ہیں جنھوں نے بہادری، ادبی، سائنسی اور کھیل وغیرہ کے میدان میں بڑے کارنامے انجام دیئے ہوں۔ ۲۶ رجنوری کو دن میں رنگا رنگ پروگرام ختم ہونے کے بعد رات میں رنگ برنگی آتش بازیوں کے چھوڑنے کا اہتمام ہوتا ہے۔

الغرض ۲۶ رجنوری کا دن ہندوستان کے نوّے کروڑ باشندوں کے لئے نئی

امنگیں اور نئی خوشیاں لے کر آتا ہے ۔ سب مل جل کر خوشی خوشی اس دن کو مناتے ہیں لیکن یہ دن اس بات کا ہم سے مطالبہ بھی کرتا ہے کہ ہم بحیثیت طالب علم اپنے تمام فرائض پورے کریں ، وہ فرائض ہیں دل لگا کر پڑھنا ، والدین اور اساتذہ صاحبان کی عزت کرنا اور ان کا حکم ماننا ، ہر امیر و غریب اور مذہب و ملت والوں کے ساتھ بھائی چارے کا برتاؤ کرنا ۔ قومی اتحاد اور آپسی میل جول کے ذریعہ ہی ہم اپنے ملک کو طاقتور اور مضبوط بنا سکتے ہیں ۔

بزرگو ، دوستو اور بچّو ! میں پھر آپ سے یہی کہوں گا کہ ہر سال ۲۶ رجنوری کے موقع پر سیکڑوں خوشیوں کے درمیان یہ عہد بھی کریں کہ ہم سب مل جل کر رہیں گے اور جی جان کی بازی لگا کر وطن کی سالمیّت ، قومی اتحاد اور آزادی کو برقرار رکھیں گے ۔

سائنس کی برکتیں

سائنس انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں " علم " لیکن اس سے وہ علم مراد ہے جو تجربات و مشاہدات کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے ۔ آج کا دور سائنس کا دور کہلاتا ہے ۔ گذشتہ سو سالوں میں سائنس نے بے انتہا ترقی کی ہے اور نت نئی ایجادات نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے ۔ قدرت کے لاکھوں برس کے سربستہ رازوں کو سائنس نے کھول کر رکھ دیا ہے ۔ زمین کا سینہ پھاڑ کر ، سمندر کی گہرائیوں میں اتر کر اور فضا کی بلندیوں میں اُڑ کر انسان نے بہت کچھ دریافت کر لیا ہے جو اب تک پردۂ راز میں تھے ۔ یہ دریافت اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گی ۔ جن چیزوں کے بارے میں انسان چند سالوں پہلے سوچ بھی نہیں سکتا تھا آج وہ ان کی زندگی میں رچ بس گئیں ہیں ۔ روزمرّہ کی زندگی میں استعمال ہونے والی سیکڑوں چیزیں سائنس کی ہی دین ہیں ۔

ہماری زندگی سائنسی ایجادات و انکشافات کی مرہونِ منت ہے ۔ آج سائنس

کی نعمتوں سے امیر غریب، چھوٹے بڑے، عورت مرد سب مستفید ہو رہے ہیں۔ گلی کوچے جنگل پہاڑ، دیہات شہر غرض چپہ چپہ سائنس کی برکتوں سے فیضیاب ہے۔

حفظانِ صحت کے خیال سے سائنس کے ذریعہ ایسی ایسی ادویات، انجکشن، آلاتِ جراحی، مختلف طرح کے اکسرے اور ریڈیائی مشینیں ایجاد ہوئی ہیں جن کی مدد سے انسان کو موت کے منھ سے نکال لینا ممکن ہوگیا ہے۔ پچھلے پچاس سالوں کے مقابلہ میں آج انسان کی اوسط عمر بڑھ گئی ہے۔ خطرناک سے خطرناک بیماریوں پر انھیں سائنسی ایجادات کے ذریعہ قابو پا لیا گیا ہے۔ جسمِ انسانی کے اندرونی حصّوں مثلاً دل، گردے، پھیپھڑے اور آنکھوں وغیرہ کا تبدیل کر دینا معمولی بات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم اپنے اسلاف اور بزرگوں کے مقابلے میں آج خوشگوار اور آرام دہ زندگی گزار رہے ہیں۔

زراعت کے میدان میں آج ہم جو ترقی دیکھ رہے ہیں وہ سب سائنس کی ہی مرہونِ منت کا نتیجہ ہے۔ ٹریکٹر، ٹیوب ویل، نہریں، کیمیاوی کھادیں۔ جدید طرز کے زراعتی آلات اور اچھے بیج وغیرہ کے ذریعہ بنجر اور ریتلی زمین بھی قابلِ کاشت ہوگئیں ہیں۔ ایک ہی کھیت سے سال میں کئی کئی فصلیں تیار ہونے لگی ہیں۔ اناج، پھل اور سبزیوں کی پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہوگیا ہے۔ آج وہی ممالک دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کہلاتے ہیں جو سائنس کے میدان میں کافی آگے بڑھ چکے ہیں۔

سائنس کا دخل کسی نہ کسی طرح ہماری زندگی کے ہر شعبے اور روزمرّہ کے استعمال ہونے والی چیزوں میں ہے۔ کارخانے اور ان میں تیار ہونے والی ہزاروں قسم کی چیزیں بجلی کی روشنی، پنکھے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، وی۔سی۔آر، ٹیپ ریکارڈر، سینما، ریل، موٹر، کیمرہ، کمپیوٹر، ٹائپ رائٹر، چھپائی کی مشین، ہوائی جہاز، ٹیلی فون، فریج، کولر، ایرکنڈیشن اور وائرلس وغیرہ سائنس کی برکتوں اور اس کی عنایتوں کے واضح ثبوت ہیں۔ ضروریاتِ زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزیں جنھیں ہم شب و روز استعمال کرتے ہیں وہ بھی سائنس کے ہی طفیل میں ہم تک پہنچی ہیں۔

آج کا انسان کس قدر خوش نصیب ہے کہ وہ تمام عیش و آرام اور تفریحی ذرائع

اس کو میسّر ہیں جو پچھلے زمانوں کے راجاؤں، نوابوں اور بادشاہوں کو نصیب نہ تھے ۔ آواز سے بھی زیادہ تیز رفتار جہازوں کی ایجاد سے مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ ٹی ۔ وی کیا کھلا کہ قطب شمالی سے لیکر قطب جنوبی تک کے بہت سے ممالک ، سمندر ، پہاڑ، اور جنگلوں کی گھر بیٹھے سیر ہو گئی ۔

انسان فطرتاً تغیر پسند واقع ہوا ہے ۔ حالات میں تبدیلی لاتے رہنا اس کی فطرت ہے ۔ چنانچہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں وہ سرگرداں اور جدت کی تلاش میں رواں دواں رہتا ہے ۔ یہی وہ فطرتِ انسانی ہے جس نے سائنس کو دن دونا رات چوگنا فروغ بخشا ۔ پچھلے سو سالوں کے اندر سائنس اور اس کے ذریعہ ایجادات کہاں سے کہاں پہنچیں مگر اتنی ترقی کے باوجود سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ فضائے بسیط کے متعلق ہماری معلومات ابھی نفی کے برابر ہیں چنانچہ تحقیقات ، مشاہدات اور ایجادات کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ کہا نہیں جا سکتا کہ مستقبل میں سائنس کیا کیا کرشمے دکھائے گی ۔ عین ممکن ہے کہ سیاروں کی دنیا سے ہماری دنیا کے لوگوں کا براہ راست رابطہ اور آمد و رفت قائم ہو جائے ٹیلی فون کے ذریعہ ہزاروں میل دور سے مزے مزے کی باتیں کرتے ہیں ۔ ہجر میں وصال کے مزے لیتے ہیں ۔ سائنس دانوں نے خلا میں جانے والے راکٹ کے ہی ذریعہ چاند پر پہنچ کر اس کی حقیقت معلوم کی ۔ دیگر سیّاروں کے متعلق بھی معلومات کا سلسلہ جاری ہے۔ موسم میں ہونے والی تبدیلیوں کی اطلاع ، فضا میں چھوڑے جانے والے مصنوعی سیاّروں کے ذریعہ ہمیں چوبیس گھنٹے قبل ہو جاتی ہے ۔ سائنس کی چھوٹی بڑی ایجادات سے ہماری زندگی کا معیار بلند ہوا ہے اور زندگی میں طرح طرح کی سہولتیں و آسائشیں پیدا ہو گئی ہیں بس ذرا بٹن دبانے کی زحمت کیجئے ، طرح طرح کے گانے سنئے ، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائیے ۔ بجلی کی روشنی سے گھر کو منور کریئے ۔

سائنس نے ہمارے مزاجوں کو بھی بدلا ہے اس نے ایک نیا ذہن اور نیا انداز فکر عطا کیا ہے۔ سائنسی دور کا انسان فرضی اور بے بنیاد باتوں پر یقین نہیں کرتا ۔ کوہ قاف میں رہنے والے دیو پریوں کی داستانوں سے دل نہیں بہلاتا ۔ توہم پرستی سے دور ہو کر حقیقت

کی دنیا میں آگیا ہے۔ ہر چیز کو حقائق اور اسباب وعلل کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔

ہر وہ شے جس میں بہت سے فائدے ہیں اُس میں کچھ نقصانات کے پہلو بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ٹی۔ وی اور سینما تفریح ومعلومات کے بہترین ذرائع ہیں مگر ان کے ذریعہ فحش اور گمراہ کُن فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں جن سے معاشرہ خراب ہو رہا ہے سائنس نے ہزاروں قسم کی مشینوں اور کارخانوں کو جنم دیا جن کی وجہ سے لاکھوں افراد بے روزگار ہوگئے ہیں۔ مذہبی رجحانات اور اخلاقی قدریں ناپید ہو رہی ہیں۔ ایٹمی توانائی کے فوائد سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اس کے ذریعہ ریلیں، مشینیں اور کارخانے چلائے جا سکتے ہیں لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ایٹمی توانائی کا بیشتر استعمال ہائڈروجن بم، ایٹم بم، نیوٹران بم اور دوسرے مہلک ہتھیاروں کے بنانے میں ہوتا ہے۔ ان کے غلط استعمال سے ایسی ایسی تباہ کن چیزیں تیار ہو رہی ہیں جن کے خوف سے بنی نوع انسان موت کے دہانے پر کھڑا نظر آتا ہے۔ ان نقصانات میں سائنس کا کیا قصور ہے؟ یہ تو ہمارے طریقۂ کار اور اندازِ فکر کی خامی ہے جو سائنس کی برکات کو تعمیری کاموں کے بجائے تخریبی کاموں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ امن پسند ممالک اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ سائنس زحمت بننے کے بجائے عوام الناس کے لئے تمام تر رحمت بنے۔

الغرض سائنس کی برکتیں لاتعداد وغیر محدود ہیں جن سے پوری دنیا فیض اٹھا رہی ہے اور یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ واقعی آج کا دور سائنس کا دور ہے۔

ہم اور ہمارا وطن

؎ پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے — خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے (اقبالؔ)

اس عنوان کے دو جزو ہیں ایک "ہم" دوسرا "ہمارا وطن"۔ اس لئے ان دونوں کی تشریح اور ایک دوسرے سے تعلق کو واضح کرنا ضروری ہے۔ "ہمارا وطن" سے اور وطن کا "ہم" سے وہی تعلق ہے جو گل کو گلستاں سے۔ اگر گلوں سے خالی گلستاں جنگل جھاڑی کے مترادف ہے تو بغیر گلستاں کے گلوں کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ایک کو

دوسرے سے عزت اور رونق حاصل ہے۔ اسی طرح ہم اور ہمارا وطن لازم و ملزوم ہیں۔ ہم ہیں تو وطن ہے اور وطن ہے تو ہمارا وجود باقی ہے۔

مضمون کے عنوان میں لفظ "ہم" اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وطن کے لئے ہم پر کچھ ذمہ داریاں اور کچھ فرائض ہیں۔ افراد کے مجموعے کا نام قوم ہے۔ جس ملک کے افراد اچھے ہوتے ہیں اس ملک کی قومی طاقت اور ایکتا بھی بے مثال ہوتی ہے۔ قوم کی خوشحالی ملک کی خوشحالی اور قوم کی پستی ملک کی پستی ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ ہم سب سے پہلے اپنے ملک ہندوستان سے محبت رکھیں۔ اور اچھے شہری بننے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ عمر اور وقت کے اعتبار سے جو بھی فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں انھیں ایمانداری سے پورا کریں۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ دل لگا کر پڑھیں، استاد اور والدین کا حکم مانیں۔ ہر امیر و غریب اور مذہب و ملت والوں کے ساتھ مل جل کر رہیں۔ یہی جذبے ہمیں آگے چل کر اچھا شہری بننے میں مدد دیں گے ہم عہد کرلیں کہ ہم ملکی قوانین کا احترام کریں گے۔ قومی یکجہتی ہمارا شعار ہوگا اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں کی عزت کرنا ہمارا فرض ہوگا۔

ہم ہندی ہیں اور ہندوستان ہمارا وطنِ عزیز ہے۔ جس طرح اپنا گھر خواہ کیسا بھی ہو پیارا ہوتا ہے اسی طرح اپنا ملک، اپنا وطن ہے جو دل و جان سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ اس کی اچھائیاں ہماری اچھائیاں اس کی برائیاں ہماری برائیاں ہیں۔ ہندوستان جب آزاد نہیں ہوا تھا تو ملک کو غلامی سے آزاد کرانا ہمارا پہلا فرض تھا مگر ملک کو آزادی مل جانے کے بعد بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا مثلاً خوراک کی قلت، جہالت، ذرائع آمد و رفت کا فقدان، صنعت و حرفت اور آبادکاری وغیرہ جنھیں ہمارے رہنماؤں خصوصاً ہند کے معمار پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد نے پنج سالہ منصوبوں کے ذریعہ بہت تیزی سے حل کیا۔ ہمارا ملک بہت بڑا ہے اس کے مسائل بھی بہت بڑے ہیں۔ جن کی طرف ہماری حکومت خاص توجہ دے رہی ہے۔ بنیادی طور پر ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اس کی تین چوتھائی آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ زراعتی ترقی کے

لئے ہمارا ملک نئی نئی اسکیموں پر عمل کر رہا ہے۔ خوراک کے معاملہ میں خود کفیل ہوگیا ہے۔
اسکول، کارخانے، سڑکیں، ریلیں، نہریں اور بجلی گھر وغیرہ بہت بڑی تعداد میں ہر سال
تیار کئے جا رہے ہیں۔ جہاں ایک سوئی نہیں بنتی تھی آج وہاں ہوائی جہاز، سمندری جہاز،
اور ریل کے انجن وغیرہ تک بننے لگے ہیں۔ سڑکوں اور ریلوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ بنجر اور
ریتیلی زمینیں سرسبز و شاداب نظر آتی ہیں۔ تعلیم گاؤں گاؤں اور گھر گھر تک پہنچ گئی ہے۔
اچھوت اور پسماندہ اقوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے پر کثیر رقم خرچ کی جا رہی ہے۔

دنیا کے دوسرے ممالک سے ہمارے تعلقات بہتر ہوئے ہیں۔ اس کی امن
پسندی اور غیر جانب دارانہ پالیسی کو دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ ہمارا
ملک تقریباً تمام مسائل پر قابو پا چکا ہے۔ مگر تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث
ہمارے تمام ترقیاتی منصوبے اپنی تمام تر کامیابی کے باوجود عوام کو مطمئن نہیں کر پا رہے
ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی ہمارے ملک کے لئے ایک خطرہ ہے اسی لئے ہماری حکومت
خاندانی منصوبہ بندی کو بہت اہمیت دے رہی ہے۔ ہمارا ملک جس تیزی سے ہر شعبے میں
ترقی کر رہا ہے اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ آبادی بڑھ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
ہمارا ملک پوری طرح ان مسئلوں پر قابو نہیں پا رہا ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان
پر ہر طرف سے دشمنوں کی نظر ہے۔ ہمیں ہر وقت چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے
فوجی جوان مادرِ ہند کی حفاظت کے لئے برفیلے پہاڑوں، تپتے ہوئے ریگستانوں اور
خوفناک جنگلوں میں ہر وقت مستعد ہیں۔ ملک کو بیرونی خطرات کے علاوہ اندرونی خطرات
بھی درپیش ہیں۔ کچھ ملک دشمن عناصر دہشت گردی پر آمدہ ہیں۔ کبھی مذہب کے نام
پر کبھی زبان کے نام پر ملک میں فسادات کراتے ہیں۔ ان پر تنگ نظری، تعصب، لسانی و صوبائی
عصبیت جیسی لعنتیں غالب ہیں۔ ایسے لوگوں سے ہمارے وطن کی سالمیت اور اتحاد کا خطرہ
ہے۔ اگرچہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ ایک مچھلی سارے تالاب
کو گندہ کرتی ہے یہ تو پھر بھی ایک سے زیادہ ہیں۔ بہر حال اتنے ترقیاتی کاموں کے ساتھ
اگر کچھ مسئلے ہیں تو کیا ہوا؟ ہم مایوس نہیں ہیں اور وطن کو مخاطب کرتے ہوئے فیض احمد

فیض نے اس شعر میں جو کچھ کہا ہے اس پر یقین رکھتے ہیں :-

جو تجھ سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

عالمی امن اور اتحاد

"امن" نام ہے آپسی میل جول اور اتفاق کے ساتھ پُرسکون حالت میں رہنے کا۔ امن اچھی چیز ہے خواہ وہ گھر، محلہ، شہر، ملک یا پوری دنیا کا ہو۔ ہر دَور میں جہاں جنگ و جدال اور خون خرابہ کا سلسلہ رہا ہے وہاں کچھ امن پسند لوگ بھی رہے ہیں جن کی جدوجہد اور کوششوں سے امن قائم رہا۔ دنیا امن پسندوں سے کبھی خالی نہیں رہی اگر خدا نخواستہ ایسا ہوتا تو دنیا اب تک ناپید ہو چکی ہوتی۔

جن لوگوں نے ۱۹۱۴ء یا ۱۹۳۹ء کی عظیم جنگیں دیکھی ہیں ان سے پوچھئے کہ جنگ اور امن میں کیا فرق ہے۔ جنگ اگر لعنت ہے تو امن بلاشبہ رحمت ہے۔ آج کی دنیا سمٹ کر چھوٹی ہو گئی ہے۔ بین الاقوامی تعلقات اس حد تک وسیع ہو گئے ہیں کہ کوئی ملک ایک دوسرے کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج امنِ عالم کو شدید خطرہ ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد دنیا کے بیشتر ممالک سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام میں بٹ گئے ہیں اور وہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ یہ دونوں بلاک اپنا لوہا منوانے اور طاقت کا مظاہرہ کرنے میں پیش پیش ہیں۔ اس کھینچاؤ اور تناؤ نے اب تیسری عالمگیر جنگ کا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ کسی بھی وقت بھیانک جنگ چھڑ سکتی ہے۔ ایٹمی آلات اور جدید ہتھیاروں کی موجودگی نے ان طاقتور ممالک کے اندر غرور پیدا کر دیا ہے۔ دنیا خوف و ہراس کے سایہ میں سانس لے رہی ہے۔ ہر طرف جنگ کے شعلے بھڑکنے کو تیار ہے۔ جدید ترین ہتھیاروں اور نیوکلیائی بموں کے تباہ کن اثرات کے خوف نے کمزور ممالک کے لوگوں کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔ تعجب نہیں کہ بڑی طاقتوں کے

جارحانہ قبضے پوری دنیا کو جنگ کی لپیٹ میں لے لیں۔ خدانخواستہ ایسا ہوا تو صرف چپ ر
نیوکلیائی بم پوری دنیا کو راکھ کے ڈھیر میں بدل دینے کے لئے کافی ہوں گے اور انسان کے
چاند پر بسنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

ان خطرناک حالات میں ضرورت ہے اُن امن پسند افراد، جماعتوں اور ملکوں کی جو
اپنی جدوجہد اور رسوخ سے دنیا میں امن قائم کر سکیں۔ امن کی باتیں تو بہت سے ممالک
کرتے ہیں ان میں امریکہ اور روس بھی ہیں مگر صرف کہنے کی حد تک' ان کے قول وفعل
میں فرق ہے۔ دراصل یہ دونوں ممالک نہیں چاہتے کہ دنیا میں امن وامان رہے۔ اگر
ایسا ہوگیا تو ہتھیاروں کی دوڑ ختم ہو جائے گی، اسلحوں کی منڈیاں بند ہو جائیں گی طاقتور
ممالک کا خوف جاتا رہے گا۔ اس لئے طاقتور ممالک کمزور ممالک کو اپنا دستِ نگر و محتاج
بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ آج دنیا میں ہونے والی ہر چھوٹی بڑی جنگوں اور تنازعوں کے
پسِ پشت کچھ طاقتور ممالک کا ہاتھ ہے۔ تیسری جنگِ عظیم کا خطرہ جس قدر آج ہے پہلے کبھی
نہ تھا اس خطرے کو جنگی تیاریوں یا اسلحے کی فراہمی سے نہیں روکا جا سکتا بلکہ ہتھیاروں پر
پابندی عائد کرکے، امن کے زور سے روکا جا سکتا ہے۔ اقوام متحدہ کا سب سے بڑا مقصد
دنیا میں امن قائم رکھنا ہے مگر یہ اپنے مقصد میں بُری طرح ناکام رہی ہے۔ ناکام کیوں نہ
ہو اقوام متحدہ پر بھی امریکہ اور روس کا ہی غلبہ ہے۔ امن سے متعلق اکثریتی ممالک کے فیصلوں
کو امریکہ اور روس ویٹو کی طاقت سے رد کر دیتے ہیں۔

دنیا میں امن برقرار رکھنے کے لئے اسلحہ پر پابندی لگانا ضروری ہے اس کے لئے پہلی
جنگِ عظیم کے بعد پیرس میں ایک کانفرنس ہوئی تھی اور یہ طے پایا تھا کہ ہر ملک صرف اپنے
بچاؤ کی حد تک اسلحے رکھے گا۔ لیگ آف نیشن نے بھی اس فیصلہ کی تائید کی تھی مگر افسوس
کہ اس پر عمل نہیں ہوا۔ کئی سالوں بعد جنیوا کانفرنس میں اسی مسئلہ کو پھر رکھا گیا مگر ہٹلر
اور مسولینی نے اس کانفرنس کے کسی فیصلہ سے اتفاق نہیں کیا۔ اب اقوام متحدہ اس امر میں
بار بار کوشش کر رہی ہے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔

چونکہ ہندوستان غیر جانب دارانہ پالیسی پر یقین رکھتا ہے۔ اس لئے عالمی

امن واتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے بھرپور کوشش کرتا ہے اور کرتا رہے گا۔ ہندوستان جنگ کی طاقت پر نہیں بلکہ امن کی طاقت پر بھروسہ کرتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے سب ہی وزرائے اعظم جیسے پنڈت جواہر لال نہرو، لال بہادر شاستری، اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی عالمی امن کو برقرار رکھنے کے لئے پیش پیش رہے ہیں۔ اس کے لئے انھوں نے گاہے گاہے اُن ممالک کی کانفرنسیں بھی بلائیں جو امن پر یقین رکھتے ہیں۔ کاش دنیا میں امن وسکون کا ماحول قائم ہو جائے اور دلوں سے جنگ کا خوف نکل جائے تو دنیا کے سب ہی ممالک ایک دوسرے کے دوست بن سکتے ہیں، ایک دوسرے کی مصیبت اور پریشانی میں مدد کر سکتے ہیں۔ ملک کی آمدنی کا جو بڑا حصہ جنگ کی تیاری اور اسلحہ سازی میں صرف ہوتا ہے وہ رفاہِ عام پر خرچ ہونے لگے گا اس طرح ہمارا معیارِ زندگی بلند ہو سکتا ہے۔ امن واتحاد کی صورت میں نہ صرف عالمی تعلّقات اور بھائی چارہ بڑھتا ہے بلکہ ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں کم قیمتوں پر آسانی سے ملنے لگتی ہیں۔ ہر فرد اور ہر ملک کو چاہیئے کہ امن واتحاد کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کرے۔ ہمیں چاہیئے کہ پوری دنیا میں نہ سہی تو کم از کم اپنے ملک، شہر اور اپنے محلّے میں امن وامان کو قائم رکھنے کی حتی المقدور کوشش کریں۔ معمولی معمولی باتیں غلط فہمی کی بنیاد پر فضا کو خراب کر دیتی ہیں۔ اس لئے ہر اُس چنگاری کو جو جنگ کا شعلہ بن سکتی ہے بجھا دیں۔ ایک اچھے شہری ہونے کی وجہ سے اگر یہ ہمارا فرض ہے تو مذہبی اعتبار سے کارِ خیر بھی ہے۔ اس لئے ہم اپنی عمر، صلاحیت اور رسوخ کے مطابق جہاں تک ہو سکے امن واتحاد کے لئے کوشش کرتے رہیں۔ ان فرائض کی تکمیل میں بہت سے فائدے ہیں اس کے علاوہ ہمارا دل بھی مطمئن رہے گا اور فخر کے ساتھ کہہ سکیں گے:۔

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

ہے دل کیلئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

(اقبال)

اگر ہم انسانی تہذیب و تمدّن کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ ہر دَور میں سائنس کی ایجادات کے غلط یا صحیح ہونے کے مسئلہ کو لے کر کچھ نہ کچھ اختلافات ضرور رہے ہیں۔ لیکن کسی زمانہ میں یہ مسئلہ نہ تو اتنا اہم رہا اور نہ اتنا موضوعِ بحث بنا جتنا کہ اس دَور میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ تھوڑے عرصہ میں سائنس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ نئی نئی مشینوں کی ایجادات اور طرح طرح کے خطرناک آلات کی دریافت نے ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے اور وہاں لاکر کھڑا کر دیا ہے جہاں کے لئے یہ شعر صادق آتا ہے:۔

مانگو دعائے خیر چمن کے لئے کہ آج
شعلے نکل رہے ہیں جبینِ بہار سے

مشینوں کی کثرت اور خطرناک ہتھیاروں کی دوڑ نے بیشک ہماری اخلاقی قدروں، لطیف احساسات، جذبۂ ہمدردی اور محبت کا گلہ گھونٹ کر رکھ دیا ہے نہ وہ پہلے جیسی لوگوں میں محبت رہی نہ انسانیت۔ مشینوں کے اس دَور میں خلوص، محبت، رواداری اور مروّت سب بے معنی الفاظ ہو کر رہ گئے ہیں۔ سائنس کی دین اور اس کی خوبیوں سے ہمیں انکار نہیں، کبھی تو سائنس کی کرامات اپنی دلکش، جاذبِ نظر، باعثِ آرام اور موجبِ تفریح مشینوں کے ذریعہ لوہا منواتی ہے تو کبھی سائنس کی وہی نعمتیں لعنتیں بن کر ہمارے اخلاق، کردار، امن و سکون، بھائی چارہ، مروّت اور ہمدردی کا گلا گھونٹتی ہیں۔

مادّیت کا خاصہ ہے کہ وہ اخلاقی قدروں، روحانیت اور مذہب کے متنازعہ ہوتی ہے اس کے تباہ کن اثرات سے دل کا چین اور ذہنی سکون جاتا رہتا ہے۔ آج کے انسان کی ذہنی ناآسودگی اور قلبی اضطراب کی وجہ بھی یہی ہے۔ اسی صنعتی انقلاب کے بُرے

اثرات کو دیکھ کر ورڈس ورتھ جو انگلینڈ کا مشہور شاعر ہے اپنی نظم میں کہتا ہے کہ "کاش میں اِس دَور میں نہ پیدا ہو کر اُس دَور میں پیدا ہوا ہوتا جب قدرتی مظاہر کی پوجا ہوا کرتی تھی اور نیچر کی پُرسکون گود میں آسودگی، ہمدردی اور پیار ہی پیار تھا۔"

ہم اس مضمون کے عنوان کو پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؔ نے کتنے قبل یہ بات بھانپ لی تھی اور اُن خدشات کا علم انھیں ہو گیا تھا جن کا ذکر انھوں نے اس شعر میں کیا ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ حقیقت کی کسوٹی پر پورا اتر رہا ہے۔ آج کا انسان مشینوں کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ آپسی میل و محبت، اُخوت و اتحاد، احساسِ مروت، مذہبی اور اخلاقی روایات وغیرہ سے وہ یکسر بے بہرہ ہوتا جا رہا ہے۔ جب مشینوں کی اس قدر کثرت نہیں تھی تو انسان کاندھے سے کاندھا ملا کر کام کرتا تھا ایک اور ایک گیارہ کا قائل تھا۔ جیسے جیسے مشینوں کا جال پھیلتا گیا دلوں کے رشتے ٹوٹتے گئے رسمی اور بناوٹی تعلقات ہمارا شیوہ بن گیا۔ کون اس سے انکار کرسکتا ہے کہ موجودہ دَور میں مادیت کا غلبہ بڑھتا جا رہا ہے اور روحانیت سسک رہی ہے۔ روحانیت کے جن سوتے سے محبت، خلوص، ہمدردی اور ایثار کے چشمے پھوٹتے تھے آج مشینوں کی گڑگڑاہٹ اور ایٹمی آلات کے دھماکوں نے انھیں خشک کر دیا ہے۔ خالقِ دوجہاں نے بنی نوع انسان کو دردِ دل کے واسطے پیدا کیا تھا مگر افسوس کہ آج وہ چار ارب باشندوں کی حیات و موت کو انگلی سے دبانے والی ایک بٹن کے نیچے رکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک خصوصاً امریکہ اور روس ایک روز میں جس قدر روپے آلات کی تیاری میں خرچ کرتے ہیں اس رقم سے پوری دنیا کے بھوکوں اور ننگوں کو سال بھر تک روٹی اور کپڑے دیئے جا سکتے ہیں مگر یہاں تو رونا احساسِ مروت کے فقدان کا ہے۔ تھوڑا بہت جو رہ گیا ہے وہ بھی جلد ہی مشینی دنیا کی نذر ہو جائے گا۔ مشینوں کے اس دَور میں سینما اور ٹی۔وی کو لیجئے، یقیناً یہ معلومات اور تفریحِ طبع کے بہترین ذرائع ہیں مگر اس کے بدلے میں ہم نے کیا پایا۔ سچ بتایئے کیا بے شرمی، بے ادبی، تضیعِ اوقات، تعلیم سے غفلت ہماری دامن گیر نہیں ہوئیں۔ عیاری، مکاری، فوجداری، چوری چماری، اسمگلنگ، غنڈہ گردی اور توڑ پھوڑ ہمارے طرۂ امتیاز

بن گئے۔ مشینوں نے لاکھوں افراد کو بے روزگار کر دیا جو بھوک اور افلاس سے تنگ آکر جرائم پیشہ بن گئے۔ کیا یہ ہمارے معاشرے کو گندہ نہیں کر رہے ہیں ؟

اب احساسِ مروّت کہاں رہا۔ ایٹم بم اور ہائڈروجن بم مندروں مسجدوں، اسپتالوں اور اسکولوں تک کو نہیں بخش رہے ہیں ان کے بے دریغ استعمال سے لاکھوں معصوم چشم زدن میں لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہیاں آج بھی اس کی شاہد ہیں۔ اپنے کو مہذّب اور ترقی یافتہ کہلانے والی قوموں نے ہزاروں کی تعداد میں جراثیم سے بھرے ہوئے بموں کا ذخیرہ کر رکھا ہے۔ خدانخواستہ ان کا استعمال ہو گیا تو بچا کھچا انسان لنگڑا لولا اور اندھا بہرہ ہو کر کس مپرسی کی زندگی گزارے گا۔ مشینوں نے انسانوں میں کاہلی اور سُستی پیدا کر دی ہے۔ چونکہ جسمانی طور پر محنت اور حرکت کے مواقع کم ہو گئے ہیں اس لئے جسمانی توانائی اور طاقت پہلے جیسے لوگوں میں نہیں رہی۔ صحت عامہ خراب ہوتی جا رہی ہے۔ الغرض مشینوں کا کثرتِ استعمال اور آلات کی فراوانی نے دلوں کو مردہ اور سخت کر دیا ہے۔ ایک دوسروں کے دُکھ درد میں شریک ہونا یا احساسِ مروّت کا اظہار کرنا زیادہ سے زیادہ ٹیلیفون کی حد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی لئے تو اقبالؔ نے کہا ہے :۔

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

میری پسندیدہ شخصیت

(پنڈت جواہر لال نہرو)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (اقبالؔ)

بہت سی عظیم ہستیاں ہندوستان میں پیدا ہوئیں جن کے نام ان کے عظیم کارناموں یا ملکی خدمات کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے مثلاً مہاتما گاندھی، ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، سرسیّد احمد خاں وغیرہ۔ ایسی سیکڑوں ہستیاں گلستانِ ہند کے خوشنما پھول کے مانند ہیں۔

اب اپنی اپنی پسند ہے کوئی کسی پھول کو پسند کرتا ہے، تو کوئی کسی کو۔ اسی طرح ہندوستان کی عظیم شخصیتوں میں مجھے پنڈت جواہرلال نہرو کی شخصیت بہت پسند ہے۔ یہ صرف ایک محبوب رہنما ہی نہیں بلکہ عظیم انسان بھی تھے۔ پنڈت جواہرلال نہرو کی اُن چند خاص خاص خصوصیات کا ذکر یہاں کروں گا جس نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔

پنڈت جواہرلال نہرو ۱۸۸۹ء میں الٰہ آباد کے ایک خوشحال خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام موتی لال نہرو تھا جو الٰہ آباد کے ایک مشہور بیرسٹر تھے۔ اگرچہ جواہرلال نہرو کی پرورش اور تعلیم انگریزی رہن سہن کے ماحول میں ہوئی مگر وہ دل سے سچّے ہندوستانی تھے۔ بچپن سے ہی اُن کے دل میں ہندوستان کی محبّت اور خدمت کا جذبہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد الٰہ آباد میں بیرسٹری شروع کی لیکن اُن کا دل اس میں نہیں لگا اور گاندھی جی کی تحریکِ آزادی میں شریک ہوگئے۔ ان کا زیادہ وقت جیلوں یا سیاسی سرگرمیوں میں گزرنے لگا۔ ۱۹۲۹ء میں پہلی بار یہ کانگریس پارٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان آزاد ہوا تو وہ یہاں کے پہلے وزیراعظم مقرر ہوئے۔ یہ زمانہ ہندوستان کے لئے بہت نازک تھا۔ سیکڑوں مسائل سے گھرے ہوئے آزاد ہندوستان کی بقا اور ہندوستانی عوام کی سلامتی کا سوال تھا۔ مگر ہمارے محبوب رہنما پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنی دور اندیشی اور جانفشانی سے اِن تمام مسئلوں کو بخوبی حل کیا۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ "پنڈت نہرو کا دل آئینہ کی طرح صاف ہے اور ہندوستان کا مستقبل نہرو کے ہاتھوں محفوظ ہے"۔

پنڈت جواہرلال نے نہ صرف ہندوستان کو غلامی کی لعنت سے نجات دلائی بلکہ ہندوستانی عوام کو سائنسی ذہن اور سوچ سمجھ کر عملی قدم اٹھانے کی طاقت بخشی ـــــ جس وقت ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی اس وقت ملک کے اندر غریبی، جہالت، پستی، نفرت، چھوت چھات، بے روزگاری اور فاقہ کشی جیسے مسائل درپیش تھے۔ چاچا نہرو نے اپنی سوجھ بوجھ اور رات دن کی لگاتار محنت سے ان سب دشواریوں پر بہت جلد قابو پا لیا۔ آزادی ملنے کے چند گھنٹے بعد پنڈت نہرو نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا:

"ساتھیو! آنے والا زمانہ آرام کا زمانہ نہیں ہے بلکہ مستقل

کوششوں اور جدوجہد کا زمانہ ہے تاکہ ان بہت سے وعدوں
کو جو پہلے اور آج کر رہا ہوں پورا کر سکیں۔ ہندوستان کی خدمت
کا مطلب ہے ان کروڑوں لوگوں کی خدمت جو مصیبت
میں مبتلا ہیں۔ شاید ہماری طاقت سے یہ باہر ہو مگر جب
تک آنکھوں میں آنسو اور تکلیفیں موجود ہیں اس وقت تک
ہمارا کام ختم نہیں ہوگا۔"

چاچا نہرو نے جیسا کہا تھا ویسا پورا کر دیا۔ ان کو محبت کا اوتار کہنا غلط نہ ہوگا۔ ان کی نگاہ میں اونچ نیچ، ذات پات اور ملک وقوم کا فرق بے معنی چیزیں تھیں۔ اسی لئے وہ سب کے پیارے تھے۔ ان کے علاوہ وہ اعلا درجہ کے تعلیم یافتہ، سائنس کے قدرداں اور مشہور ادیب بھی تھے۔ انھیں وہ لوگ پسند نہیں تھے جو کام چور اور نکمے ہیں۔ پنڈت نہرو نے ہمیں ٹکنالوجی کی طرف راغب کر کے ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے قابل بنایا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ آزادی کے ابتدائی دور میں ہندوستان کو بہت سے اہم اور دشوار مسائل سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ہمیں پنڈت جواہر لال نہرو جیسا وزیر اعظم ملا جنھوں نے انسان دوستی، غیر مذہبی حکومت، پنج سالہ منصوبے، بین الاقوامی تعلقات اور خود اعتمادی وغیرہ کے اصولوں کو اپنا کر آج ہندوستان کو اس مقام پر پہونچا دیا ہے جس کو دیکھ کر ہم فخریہ کہہ سکتے ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

قومی اتحاد اور آپسی میل و محبت کی زندگی ان کا نصب العین تھا وہ کہا کرتے تھے کہ "جو مذہب لوگوں میں نفرت پیدا کرتا ہے وہ مذہب جھوٹا ہے"۔ چاچا نہرو نے تعلیم کی ترقی اور اس کے سدھار کے لئے بہت سے کام کئے۔ مثلاً یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن، ساہتیہ اکیڈمی اور انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹکنالوجی وغیرہ کی بنیاد ڈالی۔ پسماندہ طبقوں میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے لئے ہریجنوں اور قبائیلیوں وغیرہ کے لئے تعلیمی وظائف مقرر کئے۔ قدرت نے انھیں ایسا روشن دماغ اور ارادے کا مستحکم بنایا تھا کہ مشکل سے مشکل ملکی مسئلوں کو چٹکی بجاتے حل کر لیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھیوں میں مولانا ابوالکلام آزاد اور سردار پٹیل وغیرہ تھے جنھوں نے نہرو جی

کی رہنمائی میں ملک کے لئے بڑے بڑے کام انجام دیئے۔ اسی لئے پنڈت نہرو کو جدید ہندوستان کا معمارِ اعظم کہا جاتا ہے۔ پنڈت جی کی دوراندیشی اور ان کی منصوبہ بندی سے ہندوستان کا قریہ قریہ، گاؤں گاؤں علم کی روشنی سے منوّر اور صنعت و حرفت کے فن میں یکتائے زمانہ ہے۔ آمدو رفت کے بہترین ذرائع، ملک کی دفاعی طاقت، ہماری بین الاقوامی حیثیت، جدید ٹکنالوجی میں فروغ، نہروں کی روانی، بجلی کی فراوانی، فن کاری، دستکاری اور کاشتکاری وغیرہ کی بے پناہ ترقی اس بات کی بین ثبوت ہیں کہ "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"۔
کاش یہ مردِ آہن، جدید ہندوستان کا معمارِ اعظم کچھ دن اور زندہ رہتا تو اس کے ہاتھوں ہندوستان کی تعمیرِ نو کا نامکمل کام آج منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہوا بامِ عروج پر ہوتا مگر حیف صد حیف ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کی وہ منحوس گھڑی آپہونچی جس کا اظہار روش صدیقی نے اس طرح کیا ہے:

روشنی رخت کشِ گوشۂ آرام ہوئی
دن ابھی ڈھل نہ سکا تھا کہ یہاں شام ہوئی
کچھ قیامت کے سے آثار نمودار ہوئے
ناگہاں رحلتِ نہرو کی خبر عام ہوئی

چونکہ ۱۴ نومبر چاچا نہرو کا جنم دن ہے۔ اس لئے اس دن کو بچوں کا دن یا "بال دوس" کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چاچا نہرو کو بچوں سے بے حد پیار تھا اور بچوں کو بھی ان سے بے انتہا محبت تھی اسی لئے اس دن کو "بال دوس" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ چاچا نہرو کی زندگی ایک مثالی زندگی ہے ہم ان کے نقشِ قدم پر چل کر بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔
ہمیں چاہئے کہ ہم ملک کے اندر قومی اتحاد اور خوشحالی کے لئے جی جان سے کوشش کریں تاکہ اپنی پسندیدہ شخصیت پنڈت نہرو کی ان خواہشات کو پورا کرسکیں جو وہ ہندوستان میں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان سے محبت اور عقیدت کے اظہار کا یہی سب سے عمدہ طریقہ ہے۔

میرا پسندیدہ کھیل
(کرکٹ)

قبل اس کے کہ میں اپنے پسندیدہ کھیل کرکٹ کے بارے میں کچھ لکھوں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ زندگی میں کھیلوں کی اہمیت اور ان کے فوائد کے متعلق بھی اپنے خیالات

کا اظہار کردوں۔کھیل کی زندگی میں وہی اہمیت ہے جو علم کی۔علم سے اگر دماغی نشوونما ہوتی ہے تو کھیلوں سے دماغی اور جسمانی دونوں فائدے حاصل ہوتے ہیں۔موجودہ دور میں کھیل کی اہمیت کو ماہرینِ تعلیم نے تسلیم کیا ہے۔وہ زمانہ گیا جب لوگ کہا کرتے تھے :۔

کھیلو گے کودو گے ہوگے خراب

پڑھو گے لکھو گے بنو گے نواب

مختلف طرح کے کھیل نہ صرف صحت کو بہتر بنا کر ہمارے جسم میں پھرتی اور طاقت پیدا کرتے ہیں بلکہ ہماری دلچسپی اور تفریح کے بہترین ذرائع بھی ہیں۔کھیلوں کے ذریعہ آپس میں ملنے جلنے، ایک دوسرے کو سمجھنے اور ہر رنگ ونسل، مذہب وملت کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔کھیل سے انسانوں میں خود اعتمادی، حوصلہ، رواداری، وسیع النظری اور تعاون کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔اس کے ذریعہ نظم ونسق اور قانون کی پابندی کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے کھیلوں میں بہت سے مواقع ایسے آتے ہیں جہاں کھلاڑی خودغرضی یا ذاتی مفاد سے ہٹ کر انصاف، ایمانداری، صبروتحمل اور سچائی پر مستقل مزاجی سے قائم رہتا ہے اس طرح کھیل ایک انسان کی شخصیت کو اُبھارنے اور اس کو سنوارنے میں پوری پوری مدد کرتا ہے۔

کھیلوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں

۱۔ ان ڈور گیمس

۲۔ آوٹ ڈور گیمس

اول الذکر سے مراد ان کھیلوں سے ہیں جو تھوڑی جگہ میں کھیلے جاتے ہیں۔ان میں باسکٹ بال۔والی بال۔ٹیبل ٹینس۔بیڈ منٹن۔اسنوکر (بلیرڈ) جمناسٹک شطرنج وغیرہ آتے ہیں۔

آوٹ ڈور گیمس وہ کھیل کہلاتے ہیں جن میں بہت بڑا میدان درکار ہوتا ہے۔کرکٹ فٹ بال۔ہاکی۔تیراکی۔گھوڑ دوڑ۔پول والٹ اتھلیٹک ایسے ہی کھیل ہیں جن میں۔بڑے میدانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں ہر روز شام کو کرکٹ کھیلتا ہوں مجھے یہ کھیل اس قدر پسند ہے کہ اپنے شہر دہلی

ہیں ہونے والے میچوں کو اسٹیڈیم میں جا کر دیکھتا ہوں۔ دوسرے شہروں اور ملکوں میں ہوتے والے کرکٹ میچوں کو جب بھی ٹی۔وی پر دکھایا جاتا ہے میں اسے بڑے شوق سے دیکھتا ہوں۔ ان دنوں ہندوستان اور دنیا کے بہت سے ممالک میں کرکٹ سب سے زیادہ محبوب کھیل ہے، اس کو بین الاقوامی کھیل کا درجہ حاصل ہے۔

یہ کھیل عام طور سے سردیوں میں کھیلا جاتا ہے۔ گیارہ گیارہ کھلاڑیوں پر مشتمل دو ٹیموں کے درمیان اس کھیل کا مقابلہ ہوتا ہے۔ کرکٹ کھیلنے کے لئے بڑے میدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کھیل کو کھیلنے کے لئے دو بلّے چھٹے وکٹ گیند اور پیڈ وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ منصفانہ طور پر کھیلنے کے لئے دونوں ٹیموں کے درمیان دو ایمپائروں کا ہونا ضروری ہے۔ کھیل کے میدان میں آمنے سامنے تین تین ویکٹ گاڑ دیئے جاتے ہیں جن کے درمیان بائیس گز کا فاصلہ ہوتا ہے۔ سکّہ اچھال کر اس بات کا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کون سی ٹیم پہلے کھیلے گی۔ ٹاس جیتنے والی ٹیم اگر چاہے تو اپنی مخالف ٹیم کو پہلے کھیلنے کا موقع دے سکتی ہے۔ پہلے کھیلنے والی ٹیم کے دو کھلاڑی بلّے لے کر دونوں جانب وکٹوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مخالف ٹیم کے تمام کھلاڑی اپنی اپنی جگہوں پر فیلڈنگ کرنے کے لئے مستعد ہو جاتے ہیں۔ دونوں کھلاڑی باری باری ویکٹ گرانے کے خیال سے گیندوں کو پھینکتے ہیں۔ کھلاڑی گیند کو بلّے سے روکنے اور ہِٹ مار کر دور پہونچانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ گیند جس قدر دور جا کر گرے گی اسی قدر رن زیادہ بنیں گے۔ بہت زور سے گیند کو مارنے پر اگر وہ چوکّے یا چھکّے کی حد سے باہر نکل جاتی ہے تو کھلاڑی کو بغیر دوڑے ہوئے چار یا چھ رن مل جاتے ہیں۔ وِکٹ تک پہونچنے سے پہلے مقابل ٹیم کا اگر کوئی گیند کھلاڑی وکٹوں میں مار دے تو کھیلنے والا اپنی باری کھو دیتا ہے اور وہ آؤٹ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ کھیل صحت کے لئے بہت مفید ہے لیکن ہر چیز کی زیادتی بُری ہوتی ہے۔ تمام ضروری کاموں کو چھوڑ کر یا تعلیم کی طرف سے غافل ہو کر سارے سارے دن کھیلتے رہنا بہت بُرا ہے۔ بہت سے طلبہ اپنا قیمتی وقت کھیلوں میں اس حد

تنگ لگاتے ہیں کہ ان کی پڑھائی کا سخت نقصان ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ کھیل کے وقت کھیلیں اور پڑھنے کے وقت میں پڑھائی پر توجہ دیں۔

صحبت کا اثر

صحبت سے مراد ہے کسی کے ساتھ میل جول رکھنا اور اس کے ساتھ وقت گزارنا۔ چونکہ انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے اس لئے وہ تفریحِ طبع یا ضروریات زندگی کے خیال سے ایسے لوگوں سے ملتا جلتا ہے جو اس کے ہم خیال ہوتے ہیں ان سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اور اس کے نظریات و مشورے کو قبول کرتا ہے۔ یہاں تک کہ دونوں میں باہم قربت یا دوستی ہو جاتی ہے اسی فطری عمل کا نام "صحبت" ہے۔ وہ لوگ جو انسانوں کی صحبت سے نفرت کرتے ہیں اور گوشۂ تنہائی کو اچھا خیال کرتے ہیں انہیں آدم بیزار کہا جاتا ہے۔ وہ ہرگز مہذب کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔

زندگی کو بہتر بنانے کے لئے انسان کو ہمیشہ اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہئے۔ انسان کے خیالات اور عادات کا اندازہ اس کے دوستوں، ساتھیوں اور ہم نشینوں کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے کیونکہ انسان فطرتاً اسی کو پسند کرتا ہے اور اسی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رہنا چاہتا ہے جو اس کا ہم خیال اور ہم مذاق ہو۔

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر باز با باز

اسی لئے بہت سے لوگ کسی فرد کی مزاجی کیفیت یا اس کے طور طریقوں کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس کے دوستوں اور ساتھیوں کو دیکھتے ہیں۔ یہ امر مسلّم ہے کہ جس طرح کی صحبت انسان اختیار کرے گا ویسا ہی اس پر اثر پڑے گا۔ اچھے لوگوں کی صحبت میں رہ کر انسان اچھا بن جاتا ہے اور برے لوگوں کی صحبت میں رہ کر برا بن جاتا ہے۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند
صحبتِ طالح ترا طالح کند

خداوند تعالیٰ نے ہر چیز میں کوئی نہ کوئی اثر رکھا ہے۔ وہ اثر اچھا بھی ہو سکتا ہے اور بُرا بھی۔ عالموں کی صحبت سے علم کی دولت ملتی ہے تو واعظ۔ سے تقریر کا ملکہ حاصل ہوتا ہے اور بہادروں کی صحبت وسنگت سے بہادری آتی ہے۔ اس کے برعکس چوروں، جھوٹوں اور شرابیوں کی صحبت سے وہی برائیاں ہم میں پیدا ہوں گی جن کے وہ حامل ہوتے ہیں اسی لئے والدین اپنی اولاد اور اساتذہ اپنے شاگردوں کو ہمیشہ بُری صحبت سے منع کرتے ہیں۔ صحبت کا اثر لازمی طور پر ہوتا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ انسان کو اپنی بہتری اور ترقی کے خیال سے اپنے سے زیادہ دانشمند، تجربہ کار، معتبر اور نیک خیال رکھنے والوں کی مجلس میں بیٹھنا چاہیئے۔ جس طرح علم کے ساتھ عمل کا تعلق ہے اسی طرح نو عمر اور ناتجربہ کار بچوّں کا تجربہ کار اور شائستہ افراد کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے تعلق ہے۔ ان کی صحبت میں ہی بیٹھ کر شائستگی، تجربہ، دوراندیشی اور ذہنی پختگی پیدا ہو سکتی ہے بلکہ میں یہاں تک کہوں گا کہ اچھی صحبت سے انسان مکمل انسان بنتا ہے اور اس کی روح میں پاکیزگی آتی ہے۔ اس لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ:

"کسی نیک ولی کی صحبت میں ایک گھڑی کے لئے بیٹھنا سو سال کی عبادت سے بہتر ہے"۔

گھر کا خراب ماحول خصوصاً ماں باپ کے درمیان ناخوشگوار تعلقات یا ان کا گھر سے باہر تفریحی مشاغل میں زیادہ وقت گزارنا، اولاد کے لئے بُری صحبت اختیار کرنے کا سبب بنتا ہے۔ اچھے خاندان اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کے بچےّ بھی بُری صحبت میں پڑ کر گمراہ اور بدکردار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کبھی کبھی بگڑے ہوئے لوگ اچھی صحبت پا کر سُدھر جاتے ہیں اور ان کی زندگی میں زبردست تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔ بُری صحبت کا اثر بچوّں پر بہت جلد ہوتا ہے اسی لئے بچوّں پر خاص نظر رکھنی چاہیئے اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان کے فرصت کے اوقات کہاں اور کن لوگوں کے ساتھ گزرتے ہیں۔ وہ والدین جو اپنی مصروفیت یا غفلت کے باعث اپنی اولاد پر نظر نہیں رکھتے، اکثر انہیں بعد میں پچھتانا پڑتا ہے۔ ایک سرپرست کی حیثیت سے بچوّں کو بتانا چاہیئے کہ وہ ایسے لوگوں کو اپنا دوست بنائیں جن کے طور طریقے اچھے ہیں، نالائقوں کی صحبت سے سوائے رسوائی اور نقصان کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے ہمیں اچھی صحبت اختیار کرنی چاہیئے اور بُری صحبت سے بچنا چاہیئے۔

تندرستی ہزار نعمت ہے

"تندرستی" جسم کے ہر عضو کی صحیح حالت اور ان کے ٹھیک ڈھنگ سے کام کرنے کا نام ہے۔ اس لئے تندرستی کے لئے ضروری ہے کہ جسم کے سب ہی اعضاء ٹھیک ڈھنگ سے کام کریں۔ اگر جسم کا ایک عضو بھی بیمار ہو جائے تو دوسرے اعضا بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایک تندرست شخص کو شاید اپنی تندرستی اور صحت کی اہمیت کا احساس نہ ہو مگر اس کی قدر کسی بیمار سے پوچھئے ایک بیمار کی زندگی جہنم کی زندگی ہے۔ صحت قدرت کی دی ہوئی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی طرف سے لاپروائی برتنا خدا کی ناشکری کرنا ہے۔

جن لوگوں کی صحت خراب رہتی ہے انھیں جسمانی اذیت کے ساتھ ساتھ نہ تو کھانے پینے کی لذت ملتی ہے اور نہ کسی کام میں ان کا دل لگتا ہے علاوہ ازیں ان کے متعلقین اور تیماردار بھی پریشان ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ ہر شخص کا اوّلین فرض ہے کہ وہ اپنی صحت کو مقدم سمجھے۔ تندرست انسان ہر آنے والے مصائب، تکالیف، تفکرات اور حادثات کا دلیری سے مقابلہ کرتا ہے۔ وہ ناکامی سے نہ تو مایوس ہوتا ہے اور نہ ہمت و حوصلہ ہارتا ہے۔ تندرست افراد زندگی کے تمام فرائض کو بخوبی انجام دیتے ہیں۔ اور کامیابی کی منزلیں طے کرتے ہیں۔

تندرستی ایسی بیش بہا دولت ہے کہ اس کے آگے بادشاہت اور سلطنت سب ہیچ ہے۔ جس کو یہ نعمتِ عظمٰی حاصل ہے اس کو راحتِ دین و دنیا حاصل ہے۔ جب ہی تو لوگ کہتے ہیں" جان ہے تو جہان ہے"۔ بقائے حیات اور درازیٔ عمر کا راز، تندرستی میں مضمر ہے، جاہ و جلال، مال و متاع، عزت و ثروت، اعزا و اقربا کی محبت اور ہنسی خوشی، سب ہی کچھ تندرستی کی حالت میں اچھی لگتی ہیں۔ جو رونق اور خوبصورتی تندرست انسان کے چہرے پر ہوتی ہے بیمار کے چہرے پر نہیں ہوتی۔ جو لوگ صحت کی خرابی کے باعث جسمانی طور پر کمزور ہوتے ہیں ان کے دماغ بھی کمزور ہوتے ہیں۔ انگریزی میں ایک مقولہ ہے کہ "تندرست جسم میں تندرست دماغ ہوتا ہے"۔

انسان کی ترقی کا انحصار اچھی صحت پر ہے۔ صحت کے بغیر نہ خدا کی عبادت ہو سکتی ہے اور نہ خلقِ خدا کی خدمت۔ بیمار کی زندگی جان کا وبال اور اس کے مال کا زوال بن جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ گاؤں کی زندگی صحت کے لئے مفید ہے کیونکہ وہاں پر کھلی اور صاف ہوا میسّر ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ شہری زندگی میں صحت عامہ کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور وہاں بہت سی سہولتیں بھی میسّر ہوتی ہیں اس لئے شہری لوگ زیادہ صحت مند ہوتے ہیں۔ دونوں نظریات اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اچھی صحت کا انحصار حفظانِ صحت کے اصول پر عمل کرنے سے ہے خواہ وہ دیہات میں رہتے ہوں یا شہر میں۔

اچھی صحت بنانے کے لئے کچھ خاص خاص اصول ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ان کا دھیان رکھیں مثلاً متوازن غذا، ورزش، صبح کی چہل قدمی، روزانہ کا غسل، وقت کی پابندی، کام اور آرام میں اعتدال، خوش وخرم زندگی اور پاکیزہ خیالات و عادات وغیرہ ایسے بنیادی اصول ہیں جن پر عمل کر کے انسان تندرست رہ سکتا ہے۔ کھانے پینے، کھیلنے کودنے، پڑھنے لکھنے اور سونے جاگنے سب میں میانہ روی اور پابندئ وقت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ کچھ انسانی جذبات ایسے ہیں جو صحت کے لئے سخت مضر ہیں جیسے غصّہ، بغض، حسد، غم، خوف اور لالچ وغیرہ۔ ہمیں ان سے بچنا چاہیئے۔ یہ صحت کے لئے گھُن ہیں جو اندر ہی اندر صحت کو خراب کرتی رہتی ہیں جسمانی صحت اور ذہنی سکون کے لئے ہمیں ان سب باتوں پر دھیان دینا چاہیئے۔

جو لوگ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں وہ ہمیشہ تندرست رہتے ہیں۔ تازہ پھل اور سبزیاں صحت کے لئے مفید ہیں۔ سڑے گلے پھل اور ناقص غذاؤں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ بیمار ہونے کی صورت میں علاج کی طرف فوری توجہ دینی چاہیئے ورنہ مرض طول پکڑ جاتا ہے اور صحت خراب ہو جاتی ہے۔

حفظانِ صحت کے مذکورہ بالا اصولوں کا جاننا اور ان پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے۔ جو شخص صحت کے اصولوں پر عمل کرتا ہے وہ کبھی بیمار نہیں ہوتا اور اس کی عمر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ بیشک تندرستی ہزار نعمت ہے۔ اس نعمت کا ہم جس قدر شکر ادا کریں کم ہے۔

ٹیلی ویژن

آج کا دَور سائنس کا دَور ہے اس نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے انھیں میں ایک ٹیلی ویژن بھی ہے۔ اگرچہ کچھ لوگ اس کو ایک لعنت کہتے ہیں مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ٹی۔ وی سے بہت سے فائدے ہیں اور عوام کی دلچسپی و تفریح کا بہترین ذریعہ ہے۔

ٹیلی ویژن کے فوائد

موجودہ دَور میں ٹیلی ویژن ہماری زندگی کا ایک لازمی حصہ بنتا جا رہا ہے۔ کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم تقریباً پچاس سال پہلے صرف قصّے کہانیوں کے طور پر سُنتے رہے ہیں لیکن آج ہم انہیں ٹی۔ وی میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مثلاً انٹارٹیکا کا برفیلا جزیرہ، چاند کا سفر اور اس کی حقیقت، سمندر کی سطح میں چھپی ہوئی دولت، گھنے جنگلوں کے خطرناک جانور، ایورسٹ کی چوٹی اور وہاں کے مناظر وغیرہ۔ انسان ان چیزوں کو آسانی کے ساتھ پہنچ کر نہیں دیکھ سکتا۔ ٹی۔ وی نے خواب وخیال کی باتوں کو ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ہم گھر میں بیٹھے مزے لے لے کر ان چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ ایک سے ایک حیرت میں ڈال دینے والے واقعات اور معلومات میں اضافہ کرنے والی چیزیں ہم ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ کتنی عجیب سی بات ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں اگر کچھ ہو رہا ہے تو ہم اس طرح اس کو دیکھتے ہیں گویا موقع پر موجود ہیں۔ واہ رے سائنس اور سائنس کی کرامات، بٹن گھمایا اور دنیا کی سیر شروع ہو گئی۔

ٹیلی ویژن سے ہماری معلومات میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ ٹی۔ وی کے دو چار فوائد ہوں تو گنائے بھی جائیں۔ طرح طرح کے خطرناک آپریشن ہمیں ٹی۔ وی پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ نئی نئی چیزوں کی دریافت، کارخانوں میں چیزوں کی تیاری کے طریقۂ کار، بڑے بڑے پلانٹ اور ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل، طاقتور ممالک کے جنگی عزائم، الغرض حالاتِ حاضرہ سے ہمیں پوری پوری واقفیت رہتی ہے۔ طلبہ کو ٹی۔ وی کے ذریعہ مختلف مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہر فن کے ماہرین اپنے تجربات اور فنی باریکیوں سے شائقین کو آگاہ

کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح سیکھنے کا پورا موقع ملتا ہے۔ کھیلوں کا جب سلسلہ شروع ہوتا ہے تو نہ پوچھئے کہ کیا عالم ہوتا ہے۔ کھیلوں کے مقابلے دنیا کے کسی بھی شہر میں ہو رہے ہوں اس کے شیدائی گھر میں ٹی۔ وی پر نظر جمائے بڑے آرام سے دیکھتے ہیں۔ خاص طور سے وہ لوگ جو کرکٹ میچوں کے شوقین ہیں۔ پڑھائی، دفتر، دوکان اور گھر کے کام دھام چھوڑ کر ٹی۔ وی پر میچ دیکھتے رہتے ہیں۔

ٹی۔ وی کے فوائد کے پیش نظر ہماری حکومت گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے اس کو پہنچانے کی سہولیتیں مہیا کر رہی ہے تاکہ گاؤں کے باشندے ملکی حالات اور کاشتکاری کے جدید طریقۂ کار سے واقفیت حاصل کر سکیں۔ بڑے بڑے شہروں میں بھیڑ پر قابو پانے کے لئے ٹی۔ وی سے مدد لی جاتی ہے۔ ہوائی جہاز اور ریل حادثے کو اس کے ذریعہ روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دنیا کی وہ عظیم ہستیاں جن کے نام اور کارنامے ہم دُور دُور سے سنتے ہیں۔ ان کو ٹی۔ وی میں دیکھ کر ملاقات کا لطف لیتے ہیں۔ تفریح کے نقطۂ نظر سے ہر روز دلچسپ پروگرام پیش کئے جاتے ہیں مثلاً ڈرامے، گانے، قوالی اور فلمیں وغیرہ۔ چترہار اور اتوار کی فلم سب سے زیادہ پسندیدہ پروگرام ہیں۔ بچے، بوڑھے سب ہی کئی روز پہلے سے ان پروگراموں کا انتظار کرتے ہیں۔

ٹیلی ویژن کے نقصانات

ہر اچھی اور فائدہ مند چیز اپنے اندر کچھ نہ کچھ نقصان کا پہلو بھی رکھتی ہے خاص طور سے ان حالات میں جب ان کا استعمال صحیح ڈھنگ یا اعتدال کے ساتھ نہ کیا جائے۔ یہی بات ٹی۔ وی پر بھی صادق آتی ہے۔ ٹی۔ وی سے ہمارے معاشرے کو کچھ نقصانات بھی پہنچ رہے ہیں خاص طور سے بچے اس کے مضر اثرات کے شکار ہو رہے ہیں۔ فلموں اور گانوں کے انتخاب میں اس بات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا کہ وہ فحش اور معیار سے گرے ہوئے نہ ہوں مختلف پروگراموں کے نام پر عموماً بیہودہ گانے، گندے سین، بے حیائی اور بے شرمی کی باتیں سُننے اور دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اُن شرمناک سین کو جو ہماری تہذیب و سماجی روایات کو مجروح کرتے ہیں۔ انھیں بھی باپ بیٹی، بھائی بہن سب ایک ساتھ دیکھتے ہیں۔ طلبہ کا زیادہ وقت ٹی۔ وی کے پروگراموں کو دیکھنے میں ضائع ہوتا ہے۔ اگر وہ پڑھنا بھی چاہیں تو نہیں پڑھ

سکتے کیونکہ چھوٹے سے گھر میں دوسرے بھائی بہن سارے پروگراموں کو دیکھنے کے لئے بضد رہتے ہیں۔ آنکھوں کی بینائی کو ٹی وی کمزور کرتا ہے۔ بہر حال گھر کے بڑے افراد کی ذمہ داری ہے کہ بچوں کو صاف ستھرے پروگراموں کو دیکھنے کی اجازت دیں اور پڑھنے لکھنے کے اوقات میں ٹی۔وی کو بند رکھیں تا کہ ٹی۔وی ایک لعنت نہ کہلا کر نعمت کہلائے۔

ماحول کی آلودگی (POLLUTION)

سائنس نے ہمیں جہاں بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے وہاں انسانی زندگی کے لئے پیش آنے والے خطرات اور ان سے بچنے کی ترکیبیں بھی بتائی ہیں۔ اُن خطرات میں سے ماحول کی آلودگی (POLLUTION) بھی ایک زبردست خطرہ ہے۔ اس کے بھیانک نتائج سے آج پوری دنیا خوف زدہ ہے اور ماحول کو آلودگی سے پاک وصاف رکھنے کی حتی المقدور کوشش کر رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی گنگا کی صفائی اور اُسے آلودگی سے بچانے، کارخانوں اور گاڑیوں کے دھوئیں سے پیدا ہونے والی آلودگی کو روکنے نیز جنگلات وغیرہ کے کاٹنے پر روک تھام لگانے کے مطالبے زور پکڑ رہے ہیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ماحول کسے کہتے ہیں ؟ آلودگی کس طرح انسانی زندگی کے لئے خطرہ ہے؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ہم جس فضا میں سانس لیتے ہیں، جن ندیوں، جھیلوں اور کنوؤں کا پانی پیتے ہیں، آس پاس کے جن جنگلات اور پیداوار کا ہم استعمال کرتے ہیں یہ سب ہمارے ماحول کا حصہ ہیں، یہی نہیں بلکہ تمام چرند و پرند، روشنی، نباتات، گرمی اور سردی سب ہی کچھ ہمارے ماحول کا جزو ہیں۔ جب ان قدرتی وسائل کا استعمال ہم خود غرضی اور ان کے تناسب کے بگڑنے کی پرواہ کئے بغیر کرتے ہیں تو ماحول متاثر ہونے لگتا ہے۔ ماحول کی آلودگی کا کچھ ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ غریبی، بڑھتی ہوئی آبادی، بے روزگاری اور فلورو کاربن وغیرہ بھی ماحول کو گندہ کرتے ہیں۔ آج ہمارے ملک کی آبادی اسّی کروڑ سے زیادہ ہے جو اکیسویں صدی کے آغاز تک

نئو کروڑ ہو جائے گی۔ اس تیزی کے ساتھ بڑھنے والی آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے سب ہی قدرتی وسائل پر دباؤ بڑھ رہا ہے۔ معاشی ترقی کے لئے صنعت و حرفت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے جس کے نتیجہ میں ہزاروں کارخانوں اور موٹر گاڑیوں سے نکلنے والے دھوئیں کے ذریعہ ہمارے ماحول کی فضا گندی ہوتی ہے پھر اس دھوئیں میں ملی آلودگی سانس کے ذریعہ ہمارے جسم میں دھیرے دھیرے داخل ہوتی ہے جس سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ بچے بڑوں کے مقابلے سانس کے ذریعہ زیادہ آلودگی پیتے ہیں۔ ہم جس ماحول میں رہتے ہیں اس کو آلودہ کرنے میں فلورو کاربن کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ کارخانوں کے دھوئیں کے ذریعہ بہت بڑی مقدار میں فلورو کاربن فضا میں پہنچتا ہے جو انسانی زندگی کی حفاظت کرنے والی اوزون پرت (OZONE LAYER) کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ دھوئیں کے علاوہ نقلی خوشبووں، ریفریجریٹر، ایرکنڈیشننگ، صفائی کرنے والے کیمیات اور جنگلوں کی کٹائی وغیرہ سے بھی یہ پرت رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے۔ اوزون پرت کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سورج کی مضر کرنوں کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور انھیں نیچے نہیں آنے دیتی، اگر اوزون پرت ان خطرناک کرنوں کو نیچے آنے سے نہ روکے تو آپ جانتے ہیں کیا ہوگا؟ طرح طرح کی جلدی بیماریاں، کینسر، درجہ حرارت کا بڑھ جانا اور وبائی بیماریوں کا پھیلنا شروع ہو جائے گا۔

ماحول میں بڑھتی ہوئی آلودگی اور اس کے خطرناک نتائج سے آج پوری دنیا خوف زدہ ہے کیونکہ آلودگی (POLLUTION) ایٹمی جنگ سے بھی زیادہ تباہ کن اور خطرناک ہے۔ بہت سے ممالک ماحول کو آلودگی سے پاک و صاف رکھنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ جنگلات کے نہ کاٹنے کا فیصلہ اور نئے درختوں کے لگانے کی مہم اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ہندوستان کے آئین میں قدرتی وسائل کی حفاظت اور ان کے مناسب استعمال پر زور دیا گیا ہے مثلاً ہرے درختوں کا کاٹنا اور شہری آبادی کے علاقے میں فیکٹریوں کا قائم کرنا جرم قرار دیا گیا ہے۔ آلودگی مختلف

قسم کی ہوتی ہے جیسے ہوا، پانی، زمین، آواز، ریڈیو ایکٹیو اور گرمی کی آلودگی وغیرہ۔ بھوپال گیس اور چرنوبل جیسے حادثات فضائی آلودگی کی دل ہلا دینے والی مثالیں ہیں۔ ہمارے ملک میں بڑھتی ہوئی آبادی اور ضروریاتِ زندگی کے تحت بہت تیزی کے ساتھ جنگل کاٹے جا رہے ہیں۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو سو دو سو سال بعد ہمارا ملک ریگستان میں تبدیل ہو جائے گا اور زمین کا درجہ حرارت بڑھ جائے گا۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ندیوں کا پانی آہستہ آہستہ گھٹ رہا ہے۔ جنگلی جانور، مچھلیاں اور کچھوے وغیرہ جو آلودگی کے مضر اثرات کو روکنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں اُن کی نسلیں کم ہوتی جا رہی ہیں ضرورت ہے کہ ان کا تحفظ کیا جائے۔

اقوامِ متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دنیا کی آبادی ہر دو یوم دن چالیس لاکھ بڑھ جاتی ہے اور کرۂ باد کی عالمی حرارت تیزی سے بڑھ رہی ہے جس کے نتیجہ میں زرخیز زمینوں کے بنجر ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ افریقہ سوکھے اور قحط کی زد میں آچکا ہے۔ آئندہ صدی میں ایشیا بھی قحط اور فاقے کی لپیٹ میں آسکتا ہے۔ ماہر ماحولیات مسٹر اشر کی رپورٹ کے مطابق عالمی حرارت کے باعث سمندری سطحیں بھی اوپر اٹھ سکتی ہیں جو کئی ممالک کو زیرِ آب کر دیں گی اور ماحول کی آلودگی کی وجہ سے نہ صرف عالمی غذائی سلامتی کو اندیشہ ہے بلکہ پوری دنیا کے معاشرے کا استحکام بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ عالمی درجہ حرارت میں اضافہ ایندھن جلنے سے پیدا ہونے والے دھوئیں کا نتیجہ ہے۔ ایندھن کے دھوئیں سے کرۂ باد میں موجود کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے اور ہریالی متاثر ہوتی ہے کیوں کہ کاربن ڈائی آکسائڈ کی زیادتی کی وجہ سے سورج کی گرمی سطحِ زمین کے نزدیک گھر کر رہ جاتی ہے۔

ماحول میں ہوا کی آلودگی مختلف قسم کے مادی اجزا کے ملنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً گیس، ایروسول، دھواں، نائٹروجن کاربن ڈائی آکسائڈ، سلفر، کاربن مونو آکسائڈ اور فلورو کاربن وغیرہ۔ فضا کو آلودہ کرنے والے اجزا چھوٹے بڑے کارخانوں کی چمنیوں، موٹر گاڑیوں کے انجنوں، جنگل کی آگ اور جیٹ جہاز وغیرہ سے نکلتے ہیں۔

اخبارات میں آپ پڑھتے ہی ہوں گے کہ متھرا ریفائنری سے نکلنے والے دھوئیں کی وجہ سے تاج محل کے سنگ مرمر کی سفیدی کو سخت خطرہ ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں ہوا کی آلودگی کا بہت بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ دہلی شہر بھی اس سے محفوظ نہیں ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق دریا گنج اور جامع مسجد کے گنجان علاقوں میں سب سے زیادہ آلودگی (POLLUTION) ہے۔ دہلی میں گرد و غبار کی آلودگی کا سالانہ اوسط ۳۵۰ مائکرو گرام فی مکعب میٹر ہے جو موسم گرما میں بڑھ کر ۹۰۰ مائکرو گرام فی مکعب میٹر تک پہنچ جاتا ہے۔ پانی کی آلودگی عام طور پر کیمیائی مادوں، کھاد اور جرثومے (GERMS) کی وجہ سے ہوتی ہے جس کو پینے سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ یاد رکھئے کہ صاف پانی کا نہ تو کوئی رنگ ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مزہ اور خوشبو ہوتی ہے۔

ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لئے ہندوستان کی حکومت بھی طرح طرح کی کوششیں کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت نے تیس[۳۰] سے زیادہ قوانین بنائے ہیں جن کا نفاذ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے ذریعہ ہو رہا ہے مثلاً واٹر پالیوشن ایکٹ، ایئر پالیوشن ایکٹ، فیکٹری ایکٹ، انوائرمنٹ ایکٹ، گنگا ایکشن پلان وغیرہ۔ اس کے علاوہ ریڈیو، ٹی۔ وی، اخبارات، اور پوسٹروں کے ذریعہ عوام کو ماحول کی آلودگی کے نقصانات اور اس کو صاف ستھرا رکھنے کے فوائد سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ اسی نظریہ کے تحت درسی کتابوں میں بھی آلودگی سے متعلق موضوعات کو شامل کرنے کی طرف توجہ دی جا رہی ہے۔ لیکن آلودگی کے مضر اثرات سے بچنے کے لئے محض حکومت پر ہی انحصار نہیں کرنا چاہئے بلکہ ہر شخص کو اپنی ذمہ داری نبھانے اور مِل جُل کر ماحول کو بہتر بنانے کے لئے کام کرنا چاہئے تب ہی آلودگی کے بھیانک خطرات سے بچا جا سکتا ہے۔

ایک لفظ میں

اردو زبان میں جہاں ہر طرح کے خیال کو ادا کرنے کے لئے عمدہ سے عمدہ الفاظ کے ذخیرے موجود ہیں وہیں ایسے بھی الفاظ بکثرت ہیں جو کئی لفظوں میں کہی جانے والی بات کو ایک لفظ میں ادا کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے الفاظ سے تحریر و تقریر میں اختصار کے علاوہ خوبصورتی اور مٹھاس پیدا ہوتی ہے۔ ذیل میں کچھ ایسے مخصوص الفاظ لکھے گئے ہیں جو طویل بات کو ایک لفظ میں ادا کر دیتے ہیں۔

اردو زبان کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے آپ اسی طرح کے سیکڑوں الفاظ ذہن نشین کریئے اور موقع و محل کے ساتھ ان کا استعمال کریئے :۔

ـــــ آگ کی پوجا کرنے والا	آتش پرست
ـــــ وہ پہاڑ جو آگ اُگلتا ہو۔	آتش فشاں
ـــــ آدمی کو کھانے والا	آدم خور
ـــــ آرام چاہنے والا	آرام طلب
ـــــ دودھ پلانے والی عورت	اَنّا
ـــــ تماشا دکھانے والا	بازی گر
ـــــ خواہشاتِ نفسانی کا دیوانہ	بوالہوس
ـــــ کسی کے مرنے پر عزیزوں کے گھر سے آیا ہوا کھانا۔	بھتّی
ـــــ سرائے کا مالک یا تنور جھونکنے والا	بھٹیارا
ـــــ جلد بھول جانے والا	بُھلکّڑ

لفظ	معنی
بھوبل	——— گرم راکھ
بیاض	——— وہ نوٹ بک جس پر اشعار لکھتے ہیں۔
بیضوی	——— انڈے کی طرح بلونرا۔
بیطار	——— مویشیوں کا ڈاکٹر۔
بیعنامہ	——— کسی چیز کی فروخت کا پکا کاغذ
بیعانہ	——— وہ رقم جو کسی بکے ہوئے سودے کو پکا کرنے کے لئے بطور پیشگی دی جاتی ہے۔
پالی	——— وہ جگہ جہاں پرندوں کو لڑاتے ہیں۔
پیش امام	——— نماز پڑھانے والا
پیغمبر	——— خدا کا پیغام لانے والا
تاوان	——— وہ رقم جو شکست خوردہ فاتح حکومت کو بطور خرچ ادا کرتی ہے۔
تبرّک	——— وہ چیز جو برکت کے خیال سے تقسیم کی جاتی ہے۔
تجوید	——— قرآن مجید کے پڑھنے کا فن
تجہیز و تکفین	——— مردے کے کفن و دفن کا انتظام کرنا
تخلیہ	——— تنہائی میں ملاقات کرنا
ترکہ	——— وہ جائداد جو انسان مرنے پر چھوڑ جائے
تعزیت	——— مرنے والے کے متعلقین سے اظہارِ رنج اور ہمدردی کرنا۔
تقاوی	——— وہ روپے جو سرکار کی طرف سے بطورِ امداد کاشتکاروں کو دی جاتی ہے۔
تیماردار	——— بیمار کی دیکھ بھال کرنے والا

ــــــ تیرنے والا	تیراک
ــــــ تلوار چلانے والا	تیغ زن
ــــــ وہ جگہ جہاں سکّے ڈھالے جاتے ہیں	ٹکسال
ــــــ خفیہ باتوں کا پتہ لگانے والا	جاسوس
ــــــ وہ شخص جو پھوڑے پھنسیوں کا علاج کرتا ہے۔	جرّاح
ــــــ جو وطن سے باہر نکال دیا گیا ہو	جلاوطن
ــــــ وہ کتاب جس میں نجومی ستاروں کی گردش کا سالانہ حال تاریخ وار درج کرتے ہیں	جنتری
ــــــ حضرت عیسیٰؑ کے ساتھی	حواری
ــــــ پانچ حواس ہیں (دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے، چھونے کی طاقت)۔	حواس خمسہ
ــــــ وہ ملازم جو کھانا پکانے پر مامور ہو۔	خانساماں
ــــــ درویشوں کے رہنے کی جگہ	خانقاہ
ــــــ خیمہ بنانے والے	خیاّم
ــــــ وہ غیر مسلم جو اسلامی حکومت میں رہے اور جزیہ ادا کرے۔	ذمّی
ــــــ حضرت امام حسینؓ کے گھوڑے کا نام جس پر آپ معرکۂ کربلا میں سوار تھے۔	ذوالجناح
ــــــ حضرت علیؓ کی تلوار کا نام	ذوالفقار
ــــــ بلّی، کتّے یا ہاتھی کی وہ خوراک جو روزانہ دی جاتی ہے۔	راتب
ــــــ رشوت لینے والا	راشی
ــــــ رشوت دینے والا	

ـــــ عیسائی مذہب کا وہ شخص جو تارک الدنیا ہو	راہب
ـــــ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا پیغمبر جو کتاب الٰہی بھی لائے۔	رسول
ـــــ وہ جگہ جہاں سے ستاروں کی گردش دیکھی جاتی ہے۔	رصدگاہ
ـــــ وہ عمارت جس میں ہتھیار رکھے جاتے ہیں	اسلحہ خانہ
ـــــ وہ طریقے جس پر رسول اللہ ﷺ نے عمل کیا۔	سُنّت
ـــــ قرآن شریف کا کوئی ایک باب	سورت، سورہ
ـــــ ملکوں ملکوں کی سیر کرنے والا	سیّاح
ـــــ وہ جگہ جہاں گھوڑے باندھے جاتے ہیں۔	اصطبل
ـــــ حضرت محمد ﷺ کی مکّہ سے مدینہ ہجرت کرنے والے سال سے شروع ہونے والا سن	ہجری سن (سنہ ھ)
ـــــ حضرت عیسیٰ ؑ کو سولی پر چڑھانے والے سال سے شروع ہونے والا سن	عیسوی سن (سنہ ء)
ـــــ وہ شخص جو فوج کا جھنڈا لے کر آگے آگے چلے	عَلَم بردار
ـــــ وہ شخص جو حضرت علی ؓ کی نسل سے ہو	عَلَوی
ـــــ لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقوں کا علم	عمرانیات
ـــــ دنیا کے چار بنیادی اجزاء (پانی، ہوا، آگ، مٹی)	عناصر اربع
ـــــ بیمار کی مزاج پرسی کرنا	عیادت
ـــــ وہ جنگ جس میں آنحضرت ﷺ خود شریک تھے	غزوہ
ـــــ مُردے کو نہلانے والا	غسّال
ـــــ غوطہ لگانے والا۔	غوّاص

ـــــــعلم آیت کے مطابق قرآن پڑھنے والا	قاری
ـــــــمسلمان منصف جو شرع کی رو سے فیصلہ کرے	قاضی
ـــــــقابل لوگوں کا نہ ملنا	قحط الرّجال
ـــــــقدیم رسم ورواج کی پابندی کرنے والا	قدامت پرست
ـــــــوہ قرض جو بلا سود کے لیا یا دیا جائے	قرضِ حسنہ
ـــــــبہت سے لوگوں میں سے ایک کا نام نکالنے کا طریقہ	قرعہ اندازی
ـــــــصراحی سے پانی نکلنے کی آواز	قُلقُل
ـــــــدوپہر کا کھانا کھانے کے بعد تھوڑا آرام کرنا	قیلولہ
ـــــــوہ پتھر جس پر سونے کو گھس کر پرکھتے ہیں	کسوٹی
ـــــــوہ جگہ جہاں سے چھپ کر شکار یا دشمن کو مارتے ہیں۔	کمین گاہ
ـــــــمچھلیاں پکڑنے والا	ماہی گیر
ـــــــعلم حدیث کا جاننے والا	مُحدّث
ـــــــبادشاہوں کا زنان خانہ	محل سرا
ـــــــوہ شخص جس پر دعویٰ (مقدمہ) کیا جائے	مُدّعا علیہ
ـــــــجو شخص اپنے حق کے لئے کسی پر دعویٰ کرے	مُدّعی
ـــــــوہ جگہ جہاں جانوروں کو ذبح کرتے ہیں	مَذبح
ـــــــوہ علاقہ یا شہر جہاں قابل لوگ پیدا ہوں	مردم خیز
ـــــــآدمیوں کی گنتی کرنا	مردم شماری
ـــــــٹین کا بنا ہوا وہ مرغ جو ہوا کا رخ بتاتا ہے	مرغ بادِ نما
ـــــــگود لیا ہوا بچّہ (لے پالک)	مُتبنّیٰ

ـــــ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے والا۔	مُترجم
ـــــ مشورہ کرنے والی مجلس (کمیٹی)	مجلسِ شوریٰ
ـــــ دفن کرنے کی جگہ	مدفن
ـــــ وہ عورت جو عورتوں کا بناؤ سنگار کرے	مشّاطہ
ـــــ علم سکھانے والا	مُعلّم
ـــــ عمارت بنانے والا	معمار
ـــــ فتویٰ دینے والا	مُفتی
ـــــ ناؤ چلانے والا	مَلّاح
ـــــ امتحان لینے والا	مُمتحن
ـــــ وہ شخص جو ظاہر میں مسلمان مگر دل سے کافر ہو۔	منافق
ـــــ اذان دینے والا	مُؤذّن
ـــــ مختلف کتابوں سے چھنے ہوئے مضامین کو نئے پیرائے میں ترتیب دے کر لکھنے والا۔	مُؤلّف
ـــــ ہجرت کرنے والا	مہاجر
ـــــ نہ ڈرنے والا	نڈر
ـــــ ریگستان کا وہ علاقہ جو سرسبز ہو	نخلستان
ـــــ وہ پرچہ جس پر طبیب دوائیں تجویز کرتا ہے	نسخہ
ـــــ وہ نظم جس میں آنحضرتؐ کی مدح بیان کی گئی ہو۔	نعت
ـــــ ڈاک لے جانے والا	ہرکارہ

ـــــ مختلف حروفِ تہجّی کو اعراب کے ذریعہ ملا کر لفظ بنانا۔	ہجّے
ـــــ فوجی سرداروں کا وہ دستہ جو لشکر کے آگے رہتا ہے۔	ہراوَل
ـــــ روزانہ شائع ہونے والا اخبار	روزنامہ
ـــــ ہفتہ میں ایک بار شائع ہونے والا	ہفت روزہ
ـــــ مہینہ میں ایک بار شائع ہونے والا	ماہانہ
ـــــ وہ روایتی شیطان یا جن جو ہر انسان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور مرتے وقت تک رہتا ہے۔	ہم زاد
ـــــ ایک ہی زمانہ کے لوگ	ہم عصر
ـــــ جس کا باپ مر گیا ہو۔	یتیم
ـــــ جس کے ماں باپ دونوں انتقال کر چکے ہیں۔	یَسیر
ـــــ وہ افراد جو فاتح کی شرائط پوری کرنے کے لئے بطورِ ضمانت ان کے قبضہ میں ہوں۔	یرغمال

ٹسٹ پیپر ۔ ۱

(ان کے صحیح جوابات معلوم کرنے کے لئے اس کتاب کا حصّہ اوّل دیکھئے)

وقت ۳ گھنٹے

کل نمبر ۱۵۰

(۱) ذیل کے سوالات کے مختصر جوابات لکھئے :۔

(۱) اردو کے مفرد اور مرکب حروف سے آپ کیا سمجھتے ہیں ؟ ان کی الگ الگ کتنی تعداد ہے ؟

(۲) اعراب کسے کہتے ہیں ؟

(۳) علم صرف اور علم نحو میں کیا فرق ہے ؟

(۴) لفظ اور جملہ میں کیا فرق ہے ؟

(۵) ذیل میں کچھ مثالیں لکھی ہوئی ہیں ان میں سے خطاب ، لقب ، اسم ظرف ، اور اسم مکبّر چھانٹئے :۔

ملکۂ ترنم ، شمس العلماء ، رستمِ ہند ، شاہراہ ، عیدگاہ ، گٹھڑ ، صبح ، خان بہادر ۔

(۲) (۱) صفت اور متعلق فعل میں کیا فرق ہے ؟ مثالیں بھی لکھئے ۔

(۲) فاعل اور اسم فاعل میں کیا فرق ہے ؟

(۳) ذیل کے حاصل مصدروں سے اسم فاعل اور اسم مفعول بنایئے :۔

ظلم ، عبادت ، حسد ، طلب

(۴) فعل لازم اور فعل متعدی میں کیا فرق ہے ؟ مثالوں سے واضح کیجئے :۔

(۵) فعل معروف اور فعل مجہول کے فرق کو بتایئے ؟

(۳) (۱) حروف تحسین ، حروف ندا اور حروف اضافت کی تعریف لکھئے اور دو دو مثالیں

دیجئے ؟

(۲) پانچ مرکب الفاظ ایسے لکھیے جن میں صفت اور موصوف دونوں پائے جاتے ہوں؟
جیسے لال کپڑا۔

(۳) ذیل کے اسم سے صفت نسبتی بنائیے (جیسے بنگال سے بنگالی)
نور ، پشاور ، سونا ، دہلی ، مذہب

(۴) ان الفاظ سے اسم ظرفِ مکان بنائیے :۔
عید ، کتاب ، گل ، مے ، عبادت

(۵) ماضی مطلق اور ماضی استمراری کے فرق کو واضح کریئے ؟

(۴) (۱) ذیل میں کچھ حروف تہجّی لکھے ہوئے ہیں کچھ مٹ گئے ہیں ان کی خالی جگہوں کو ایسے حروف تہجّی سے پُر کریئے کہ وہ مکمل لفظ بن جائے :۔

ا ـــ د ـــ ا ـــ ا د ـــ ی [اردو اکادمی]
(الف) ت ـــ ل ی ـــ ی [ ]
(ب) خ و ـــ ـــ ش [ ]
(پ) ـــ رخ ـــ ا ـــ ت [ ]
(ت) م ـــ ل ـــ م ـــ ت [ ]

(۲) ذیل میں کچھ حروف تہجّی لکھے ہوئے ہیں ان سب کی یا ان میں سے کچھ کی مدد سے بننے والے پانچ الفاظ لکھیئے :۔ (جیسے صورت)
ت ـ ر ـ س ـ ص ـ ف ـ و ـ ی

(۳) ذیل کے الفاظ کی املا درست کر کے لکھیئے :۔
اولُلعزم ـــ بلکل ـــ ذافران ـــ نیمل بدل ـــ الصباح

(۴) ذیل میں پانچ پانچ سابقے اور لاحقے لکھے ہوئے ہیں ہر ایک سے بننے والے دو دو الفاظ لکھیئے :۔ (جیسے خوش مزاج ، مے کدہ)
سابقے :۔ خوش ، لا ، عدم ، ذی ، ہم ۔

لاحقے :۔ کدہ ، خوار ، افزا ، زدہ ، مند

(۵) ذیل کے الفاظ مذکر ہیں یا مؤنث :۔

معلمہ ، شہرت ، وارث ، موتی ، دہی ، برقع ، عزت ، دوپٹہ ۔

(۵) (۱) ان میں سے کسی پانچ الفاظ کی جمع الجمع لکھئے :۔

امر ، اہل ، جوہر ، خبر ، دوا ، رسم ، عجیب ، فتح ، وجہ ، رقم ۔

(۲) ان الفاظ کی ضد لکھئے :۔ ظاہر ، ازل ، ارض ، خوش نما ، اقلیت ۔

(۳) ذیل کے جملوں میں مختلف طرح کی مثلاً املے ، قواعد اور روزمرّہ کی غلطیاں ہیں انھیں درست کر کے لکھئے :۔

(الف) میں صدا اپنے خیر خاہوں کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں ۔

(ب) اگر آپ تھوڑی سی میٹھی دہی دیدیں تو مشکور ہوں گا ۔

(پ) آپ میرے دولت خانہ پر تشریف لایئے میں آپ کو آب ذم ذم کا پانی پلاؤں گا ۔

(ت) دراصل میں تم بہت بے فضول باتیں کرتے ہو ۔

(ج) غرباؤں کی مدد کرنا کارِ ثواب کا کام ہے ۔

(ح) آپ برائے مہربانی کر کے خط کا جواب جلد ارسال کریں ۔

(خ) تاج محل سنگ مرمر کے پتھروں سے بنی ہوئی ایک خوب صورت امارت ہے ۔

(د) آپ چند دن بے ناغہ گل روغن کا تیل استعمال کریئے ۔

(۴) ذیل میں متشابہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں ان میں سے کسی پانچ کے معنی لکھ کر ان کے فرق کو واضح کریئے :۔

(عبد ، ابد) ، (آری ، عاری) (اِصرار ، اَسرار) (اَلَم ، عَلَم) (حاجی ، باجی) (خار ، خوار) (سفیر ، صفیر) (صدا ، سدا) (عرض ، ارض) ۔

(۵) خالی جگہوں کو بریکٹ میں دیئے ہوئے مناسب الفاظ سے پُر کیجئے :۔

(۱) نواب صاحب نے ہر چند بلایا مگر مرزا غالب اس قلیل . . . . پر جانے کے لئے رضامند نہیں ہوئے ۔ (مشاہرہ ۔ مشاعرہ)

(۲) میرے متعلق آپ کا یہ حسنِ .... ہے۔ (زن ۔ ظن)

(۳) سر سید احمد خاں بجنور میں جج کے عہدہ پر ...... ہوئے۔ (مامور ۔ معمور)

(۴) میں نے پہلے ہی یہ بات .... کر دی تھی ۔ (وانح ۔ واضح)

(۵) اس نے ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچ کر اپنا جھنڈا ...... کیا۔ (نسب ۔ نصب)

(۶) بچے .... ہوتے ہیں۔ (ماثوم ۔ معصوم)

(۷) لغاتِ کشوری کے ...... مولوی تصدق حسین ہیں۔ (مصنف ۔ مؤلف)

(۸) ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نغمہ سرا

صلائے عام ہے یارانِ ..... داں کے لئے (نقطہ ۔ نکتہ)

(۶) (۱) پانچ متروک الفاظ یا کوئی دو اشعار ایسے لکھئے جن میں متروک الفاظ ہوں ؟

(۲) اعضائے انسانی سے بننے والے کوئی سے پانچ محاورے اور ان کے معنی لکھئے ؟

(۳) تشبیہہ اور استعارہ میں کیا فرق ہے ؟ مثالوں کے ذریعہ واضح کیجئے ؟

(۴) ردیف اور قافیہ میں کیا فرق ہے ؟ کوئی شعر لکھ کر ان دونوں کی نشاندہی کریئے۔

(۵) ذیل کے جملوں میں مجازِ مرسل اور تلمیح کی نشاندہی کریئے :۔

نالا بہہ رہا ہے۔ "ابنِ مریم ہوا کرے کوئی ۔ وہ تو آبِ حیات پی کر آیا ہے۔ ہانڈی پک گئی ۔ "تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ" ۔ دوات پھیکی ہے ۔

(۷) (۱) چار مرکب الفاظ ایسے لکھئے جو حرفِ عطف (و) کے ذریعہ جڑے ہوں۔

(۲) استعارہ اور مجازِ مرسل میں کیا نمایاں فرق ہے ؟

(۳) ان جملوں کو مکمل کریئے :۔

(ا) کاہلی افلاس کی ....۔

(ب) بڑھیا کے مرنے کا غم ....۔

(پ) زبانِ خلق کو ....۔

(ت) غزل کا بہترین شعر .... کہلاتا ہے۔

(ث) ہر شاعر کی .... یادگار اس کا ...... ہوتا ہے۔

(۴) مطلع، مقطع اور حسنِ مطلع میں سے کسی دو کی تعریف معہ مثال لکھئے ؟

(۵) خط کتنے طرح کے ہوتے ہیں اور اس کے کتنے حصے ہوتے ہیں سب کے نام لکھئے ؟

(۸) "اردو زبان و قواعد" حصہ اوّل اور دوم کی پانچ پانچ جلدیں بذریعہ وی۔پی منگوانے کے لئے مکتبہ جامعہ اردو بازار دہلی ۶ کو ایک خط لکھئے۔

(۹) ذیل میں کچھ ملے جلے "القاب" اور "خاتمے" کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں بڑوں کو خط لکھنے کے لئے ان میں سے کون کون سے القاب اور خاتمے کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں انھیں چھانٹ کر الگ لکھئے :۔

القاب :۔ قبلہ گاہی، محبِ من، قبلہ وکعبہ، مکرمی و معظمی، نور چشمی، عزیزمن، برادرم، حضور والا، مشفق من، جناب من، برخوردار ... سلمہٗ، جناب عالی۔

خاتمہ :۔ دعا کا طالب، خیر اندیش، دعاگو، فدوی، تمہارا اپنا، احقر، فرمانبردار، خدا حافظ، زیادہ پیار، کمترین، خادم، نیازمند۔

(۱۰) ذیل کے عنوانات یا اشاروں سے کسی ایک پر ۱۵۰ الفاظ پر مشتمل ایک پیراگراف لکھئے جو ادبی پیرایہ میں ہو :۔

عنوانات : (۱) اردو زبان کا مستقبل۔

(۲) اگر میں اردو زبان کا استاد ہوتا۔

اشارے :۔ (۱) وہ گھر آسیب زدہ ہے ہر روز کوئی نہ کوئی واقعہ سننے میں آتا ہے آج ....

(۲) ہر طرف ہو کا عالم تھا اس خوفناک رات میں تقریباً ۲ بجے کسی نے دستک دی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ....

ٹسٹ پیپر ۲

(ان سوالات کے صحیح جوابات آپ کو اسی کتاب میں ملیں گے)

وقت ۳ گھنٹے

کل نمبر ۱۵۰

(۱) (۱) ضمیر موصولہ کی تعریف معہ مثال لکھئے؟

(۲) صفت مشبّہ اور اسم فاعل میں کیا فرق ہے؟

(۳) اسم جمع کسے کہتے ہیں اس کی پانچ مثالیں لکھئے؟

(۴) فعل ناقص اور فعل مستقبل کی تین تین مثالیں لکھئے؟

(۲) (۱) کسی لفظ کے "لغوی اور مجازی معنی" سے کیا مراد ہے؟

(۲) روزمرّہ اور محاورہ میں کیا فرق ہے؟ ان کی مثالیں بھی دیجئے؟

(۳) محاورہ اور ضرب المثل (کہاوت) میں کیا فرق ہے؟

(۴) ذیل میں کچھ محاورے اور ضرب الامثال ملے جلے لکھے ہوئے ہیں انھیں چھانٹ کر الگ الگ لکھئے؟

آستین کا سانپ ہونا۔ پھول نہ پان کہنے کو مہمان۔ اونٹ کے منھ میں زیرا۔ جوتیوں میں دال بٹنا۔ پیٹ کا ہلکا ہونا۔ نو سو چوہے کھا کر بلّی حج کو چلی۔ چراغ سحری ہونا۔ چراغ لے کر ڈھونڈنا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی بھلی۔ چھٹی کا دودھ یاد آجانا۔ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل۔ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ کان پر جوں رینگنا۔ دریا میں رہنا مگرمچھ سے بیر۔

(۳) (۱) ذیل کے اصنافِ سخن میں سے کسی تین کی تعریف لکھئے اور مثالیں بھی دیجئے؟

غزل، قصیدہ۔ رباعی۔ مرثیہ۔ مثنوی۔ ترکیب بند۔ نظم۔

(۲) "قطعہ" اور "غزل" میں کیا فرق ہے؟

(۳) مندرجہ ذیل شعرا اردو ادب میں کس صنفِ سخن کے نمائندہ شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں:۔

سودا ۔ جوش ۔ حسرت ۔ انیس ۔ اختر انصاری ؛ دیا شنکر نسیم ۔ امجد علی امجد ۔ ذوق ۔ میر تقی میر ۔ میر حسن ۔ چکبست ۔

(۴) بچوں کے لئے نظمیں لکھنے والے دو مشہور شعراء کے نام لکھئے ؟

(۴) (۱) ذیل کی نثری اصناف میں سے کسی تین پر مختصر نوٹ لکھئے :۔

داستان ، ناول ، افسانہ ، ڈرامہ ، انشائیہ ، مزاح نگاری ، سوانح نگاری ، خاکہ نگاری ، تنقید نگاری ۔

(۲) مذکورہ بالا اصناف میں شہرت پانے والے دو دو نمائندہ ادیبوں کے نام لکھئے:۔

(۳) مذکورہ بالا نثری اصناف کی ایک ایک مشہور کتاب اور اس کے مصنف کا نام لکھئے :۔

(۴) ذیل کی کتابوں کو زمانۂ تصنیف کے اعتبار سے اس طرح ترتیب دیجئے کہ ان میں سب سے قدیم تصنیف سب سے پہلے اور سب سے بعد کی کتاب سب کے آخر میں ہو ۔

شعرالعجم ، آگ کا دریا ، مراۃ العروس ، فسانۂ آزاد ، باغ و بہار ، بازارِ حسن ، سب رس ، فسانۂ عجائب ، معراج العاشقین ، کربل کتھا ۔

(۵) (۱) صنائع اور بدائع کسے کہتے ہیں ؟

(۲) ذیل کی صنعتوں میں سے کسی تین کی تعریف معہ مثال لکھئے :۔

صنعتِ تضاد ، حسنِ تعلیل ، لف و نشر ، صنعتِ ایہام ، مراعاۃ النظیر ، تلمیح ۔ صنعتِ تجنیس ۔

(۳) ان اشعار میں جو بھی صنعتِ شعری (صنائع و بدائع) پائی جاتی ہو سامنے دیئے ہوئے صنائع و بدائع میں سے اس کا صحیح نمبر بریکیٹ میں لکھئے ۔

(الف) کہا دل نے میرے دیکھی جو وہ مانگ ۱۔ تشبیہہ
کہ ہے یہ رات آدھی کچھ دعا مانگ ( )

(ب) نہ آیا اور کچھ اس چرخ کو آیا تو یہ آیا
گھٹانا وصل کی شب کا بڑھانا روزِ ہجراں کا ( ) ۲۔ صنعتِ ایہام

(ت) سنی کسی نے نہیں غم کی داستاں میری
وہ کم سخن ہوں کہ گویا نہیں زباں میری ( ) ۳۔ صنعتِ تضاد

(ث) ہر دین ہے ہر خوشۂ انگور کا عالم
ہر خار پہ ہے مژۂ حور کا عالم ( ) ۴۔ صنعتِ تجنیس

(ج) آ رہی ہے چاہِ کنعاں سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت ( ) ۵۔ حسنِ تعلیل

(س) خدا جانے صبا ہر روز کیا پیغام لاتی ہے
کہ پہروں کانپتے رہتے ہیں تنکے آشیانوں کے ( ) ۶۔ صنعتِ تلمیح

(۴) ایسے چار اشعار لکھئے جن میں تلمیح پائی جاتی ہو ؟

(۶) ان کے مختصر جوابات لکھئے :۔

(۱) غالبؔ کے خطوط کی خوبیاں لکھئے ؟

(۲) فورٹ ولیم کالج کس نے قائم کیا اور اس کے قیام کا کیا مقصد تھا ؟

(۳) دبستانِ دلی اور دبستانِ لکھنؤ کے اندازِ شاعری میں کون کون سا نمایاں فرق ہے ؟

(۴) اردو زبان میں کن کن زبانوں کے الفاظ شامل ہیں ؟

(۵) فورٹ ولیم کالج کی کوئی سی تین تصانیف اور اس کے مصنف کا نام لکھئے ؟

(۷) (۱) رموزِ اوقاف کسے کہتے ہیں ؟ کوئی سے تین اوقاف کے نام اور اس کی علامت تحریر کریئے ؟

(۲) ان کے لئے ایک لفظ لکھئے :۔ جیسے (وہ جگہ جہاں سکے ڈھالے جاتے ہیں ٹکسال)

(ا) جو وطن سے باہر نکال دیا گیا ہو =

(ب) بیمار کی خدمت کرنے والا =

(ت) کسی کام یا بات کے انجام کو سوچنے والا =

(ث) تیرنے والا =

(ج) پرندوں کی لڑائی کی جگہ =

(۳) دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دلّی کے چار چار شعراء کے نام لکھئے ؟

(۴) "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" سے کیا مراد ہے ؟

(۵) اردو زبان کن کن ناموں سے پکاری گئی ۔

(۸) ذیل کی عبارت کے مفہوم کو بہت ہی مختصر اور آسان لفظوں میں لکھئے :۔

درباروں سے اردو کا رشتہ بڑا معنی خیز ہے ۔ اردو نے درباروں سے نہیں، بلکہ خود درباروں نے اردو سے رشتہ پیدا کیا ۔ اردو اصلاً بازاروں، گلیوں، کوچوں، میلوں ٹھیلوں، جوگیوں، سنتوں، فقیروں اور صوفیوں کی زبان ہے اور ان ہی فقیروں سنتوں اور صوفیوں نے اسے قریہ قریہ اور شہر شہر پھیلایا اور سورج کی کرنوں کی طرح یہ جہاں جہاں پہنچی آنکھوں میں بستی اور دلوں کو شاداب کرتی گئی ۔ اس کی پشت پر ہمیشہ انسان دوستی، وسیع النظری اور محبت یگانگت کا وہ تصور رہا جس سے قومیں عروج پاتی ہیں اور تاریخ میں ان کے کارناموں کے نقش جگمگاتے رہتے ہیں ۔ یہی وہ زبان ہے جس کی ملتی جلتی شکلوں میں بھگتوں سنتوں اور صوفیوں نے توحید کے ترانے گائے، خواجہ معین الدین چشتیؒ ہوں یا حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیاء ہوں یا خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، دادو دیال ہوں یا رے داس، رامانند ہوں یا تکارام، کبیر ہوں یا نانک، سیکڑوں صوفیوں، سنتوں اور اولیاء اللہ نے اس زبان کے سر پر شفقت اور دعاؤں کا ہاتھ رکھا، اور مذہبوں کی ظاہر داری سے ہٹ کر باطنیت کے جوہر کو دیکھا، اور روحانیت اور سچی انسانیت کے پیغام سے لاکھوں، کروڑوں انسانوں کے دلوں کو آباد کیا ۔

(۹) کسی نے یہ اک مردِ دانا سے پوچھا ۔۔۔ کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا

کہا عقل جس سے ملے دین و دنیا ۔۔۔ کہا گر نہ ہو اس سے انساں کو بہرہ

کہا پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے ۔۔۔ کہ جو باعثِ افتخارِ بشر ہے

کہا گر نہ ہو یہ بھی اس کو میسّر ۔۔۔ کہا مال و دولت ہے پھر سب سے بڑھ کر

کہا اس پر بجلی کا گرنا ہے بہتر   کہا اور ہو یہ بھی گر بند اس پر
خلائق سب اس کی لعنت سے چھوٹے   وہ ننگِ بشر تا کہ ذلت سے چھوٹے

مندرجہ بالا اشعار کو بغور پڑھئے پھر ان سوالات کے جوابات مختصراً لکھئے:۔

(۱) دنیا میں سب سے اہم ترین شے شاعر نے کس کو قرار دیا ہے؟

(۲) جو شخص عقل سے بے بہرہ ہو اس کے لئے شاعر کا کیا مشورہ ہے اور کیوں؟

(۳) وہ شخص کون ہے جو عوام الناس کے لئے ایک لعنت ہے؟

(۴) وہ کون لوگ ہیں جن کے متعلق ان اشعار کو پڑھ کر کہا جا سکتا ہے کہ "خس کم جہاں پاک"؟

حصہ ب (معروضی (DESCRIPTIVE) سوالات)

۱۔ غزل کو اردو شاعری کی آبرو کیوں کہا گیا ہے؟

۲۔ داستان، ناول اور افسانہ کے فرق کو واضح کریئے؟

۳۔ ولی دکنی کو اردو شاعری کا بابا آدم کیوں کہا جاتا ہے؟

۴۔ قدیم و جدید اردو شاعری سے کیا مراد ہے۔ دونوں ادوار کے کچھ شعراء کے نام لکھئے؟

۵۔ سودا کے کلام میں "واہ" اور میر کے کلام میں "آہ" ہے اس کی وضاحت کیجئے؟

۶۔ اقبال کو "شاعرِ مشرق" کیوں کہا گیا ہے۔ مثالوں کے ذریعے اس کی وضاحت کریئے؟

۷۔ ڈرامے کے اجزائے ترکیبی کون کون سے ہیں۔ ان کی اہمیت پر روشنی ڈالئے؟

۸۔ اردو کے عناصرِ خمسہ کے نام لکھئے اور ان میں سے کسی ایک کے اسلوب تحریر پر اپنے خیالات کا اظہار کریئے؟

۹۔ ذیل کی نظمیں کن شعراء کی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا مرکزی خیال واضح کریئے؟
ایک لڑکا۔ خضرِ راہ۔ مس سیمیں بدن۔ شعاعِ امید۔ شکستِ زنداں کا خواب۔

۱۰۔ فصاحت و بلاغت سے کیا مراد ہے۔ ان کے فرق کو واضح کیجئے؟

ٹسٹ پیپر ۳

(سب ہی سوالات ایک ایک نمبر کے ہیں)

وقت ۱ گھنٹہ

کل نمبر ۶۰

(۱) (۱) .... کو اردو شاعری کا بابا آدم کہا جاتا ہے۔

(۲) میر تقی میر کو ...... کہا جاتا ہے تو .... کو شہنشاہِ قصیدہ۔

(۳) شعر کی موزونیت کو پرکھنے کے لئے شعر کو .... کے ذریعہ بحر کے ارکان پر وزن کیا جاتا ہے۔

(۴) کہا جاتا ہے کہ اردو زبان کی سب سے پہلی نثری کتاب .... ہے۔

(۵) ...... نے اپنی مشہور کتاب .... میں مرزا غالب کو "حیوانِ ظریف" کہا ہے۔

(۶) اردو کا سب سے پہلا ڈرامہ ...... ہے اس کے مصنف کا نام ..... ہے۔

(۷) انجمن ترقی اردو کے بانی .... ہیں۔

(۸) جس طرح "اضافت" میں "مضاف" اور "مضاف الیہ" کا ہونا ضروری ہے اسی طرح تشبیہ میں ...... اور ...... کا ہونا ضروری ہے۔

(۲) بریکٹ میں دیئے ہوئے تین جوابات میں سے ایک پر صحیح (✓) کا نشان لگایئے۔

(۱) جملوں کی ساخت اور الفاظ کے باہمی تعلق کے علم کو (علمِ صرف / علم نحو / علم ہجا) کہتے ہیں۔

(۲) کلام میں الفاظ کے معنوی حسن کو بڑھانے اور اس کو مختلف طریقوں سے پیش کرنے کے علم کو (علمِ بیان / علم صرف / علم عروض) کہتے ہیں۔

(۳) اردو زبان کی عمر زیادہ سے زیادہ (دو سو سال / ایک ہزار سال / دو ہزار سال) ہے

(۴) ہندوستان میں اردو کو (۱۸۵۷ء / ۱۸۳۵ء / ۱۸۸۵ء) میں سرکاری زبان کا درجہ ملا۔

(۵) جدید نثر کے بانی (مرزا غالب / سر سید / پریم چند) ہیں۔

(۶) اردو زبان (اورنگ زیب / شاہجہاں / بہادر شاہ ظفر) کے دور میں "اردوئے معلّے" کے نام سے مشہور ہوئی۔

(۷) فورٹ ولیم کالج کا قیام (۱۸۱۰ء / ۱۹۰۰ء / ۱۸۰۱ء) میں ہوا۔

(۸) ڈرامہ "انارکلی" کے مصنف کا نام (امتیاز علی تاج / امانت لکھنوی / آغا حشر کاشمیری) ہے۔

(۳) ہر تصنیف کے سامنے اس کے صحیح مصنف کا نمبر شمار لکھ دیجئے۔

تصنیف		نمبر	مصنف
سب رس	________	۱۔	مرزا ہادی رسوا
غبارِ خاطر	________	۲۔	محمد حسین آزاد
فسانۂ آزاد	________	۳۔	ابوالکلام آزاد
حیاتِ جاوید	________	۴۔	ملّا وجہی
آبِ حیات	________	۵۔	الطاف حسین حالی
شعلہ و شبنم	________	۶۔	شبیر حسن جوش
آثار الصنادید	________	۷۔	قرۃ العین حیدر
غبن	________	۸۔	رتن ناتھ سرشار
آگ کا دریا	________	۹۔	منشی پریم چند
امراؤ جان ادا	________	۱۰۔	سر سید احمد خاں

(۴) (۱) رسالہ تہذیب الاخلاق . . . . نے جاری کیا۔

(۲) "الہلال" اور "البلاغ" رسالے . . . . نے نکالے۔

(۳) ۱۸۷۴ء کے مشاعرے سے . . . . کی بنیاد پڑی۔

(۴) . . . . کو اردو کا پہلا ناول نگار کہا جاتا ہے۔

(۵) اکبر الٰہ آبادی . . . . کے بادشاہ کہے جاتے ہیں۔

(۶) . . . . کو "شاعرِ انقلاب" کہا جاتا ہے۔

(۷) ذوقؔ بہادر شاہ ظفر کے .... اور مرزا غالبؔ کے ..... تھے۔

(۸) .... کی بنیاد آزادؔ اور حالیؔ نے ڈالی۔

(۵) ان شعراء کا پورا نام کیا ہے؟ ان کے تخلص کے سامنے بریکٹ میں ان کے صحیح نام کا نمبر شمار لکھ دیجئے:۔

جوشؔ	( )	۱۔ محمد ابراہیم
دانشؔ	( )	۲۔ برج نرائن
ذوقؔ	( )	۳۔ احسان الحق
چکبستؔ	( )	۴۔ رگھوپتی سہائے
جگرؔ	( )	۵۔ حیدر علی
آتشؔ	( )	۶۔ شبیر حسن
فراقؔ	( )	۷۔ علی سکندر
حسرتؔ	( )	۸۔ فضل الحسن

(۶) جو جواب آپ کو ٹھیک معلوم ہو اس پر صحیح (✓) کا نشان لگا دیجئے۔

(۱) "اردو" (عربی / فارسی / ترکی) زبان کا لفظ ہے۔

(۲) استعارہ میں لفظ اپنے (مجازی / اصطلاحی / لغوی) معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

(۳) رباعی میں (دوسرے / تیسرے / چوتھے) مصرعہ کا قافیہ باقی تین مصرعوں سے الگ ہوتا ہے۔

(۴) "مد و جزر اسلام" (اقبالؔ / حفیظؔ جالندھری / حالیؔ) کی لکھی ہوئی ہے۔

(۵) "خضرِ راہ" اور "مسجدِ قرطبہ" (حالیؔ / اقبال / فیض) کی لکھی ہوئی نظمیں ہیں۔

(۶) اردو کو (برج بھاشا / فارسی / کھڑی بولی) کی بیٹی کہا جاتا ہے۔

(۷) ولیؔ دکنی (اورنگ زیب / شاہجہاں / جہانگیر) کے دورِ حکومت میں پہلی بار دہلی آئے تھے۔

(۸) (میر امنؔ / مرزا غالب / سر سیّد احمد خاں) اردو کے عناصرِ خمسہ میں سے ایک ہیں۔

(۷) موجودہ دور کے :- ۱- دو مشہور شعراء کے نام- ۲- دو مشہور اردو اخباروں کے نام-
۳- دو ادبی رسالوں کے نام- ۴- دو افسانہ نگاروں ۵- دو ناول نگاروں کے نام-
۶- دو غیر مسلم شعراء کے نام- ۷- ان دو ریاستوں کے نام لکھئے جہاں اردو کو قانونی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے-

حصہ ب (قواعد سے متعلق سوالات)

- "علم ہجا" کسے کہتے ہیں؟
- علم عروض اور علم بیان سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ ان کے تحت کون کون سی چیزیں آتی ہیں؟
- ذیل کی تعریف مع مثال بیان کریئے:- ضمیر اشارہ- صفت عددی- مبتدا اور خبر- فعل مجہول- ضمیر استفہامیہ- اعراب، مضاف الیہ-
- تعریف مع مثال بیان کریئے:- صنعت تضاد- حسن تعلیل- سیاقۃ الاعداد- توشیح- تنسیق الصفات- سجع- لف و نشر- تجنیس تام-
- مندرجہ ذیل کی تعریف کیجئے اور مثالیں بھی دیجئے:- ساکن اور متحرک حروف- حروف شمسی و حروف قمری- حروف مفرد اور مرکب- حروف ندا- حروف ربط- حروف عطف-
- علم عروض میں "تقطیع" کسے کہتے ہیں؟ کسی ایک شعر کی تقطیع کیجئے-
- اردو قواعد کو کن پانچ موضوعات کے زیر بحث تقسیم کیا گیا ہے؟
- ان کی تعریف مع مثال بیان کریئے:- تشبیہ اور ارکان تشبیہ- استعارہ- مجاز مرسل- کنایہ- دلالت التزامی- مرکب تام- مستعار منہ-
- ان کی تعریف مع مثال کیجئے:- ارکان عشرہ- زحاف- وتد- سبب- فاصلہ- بحر مفرد- وزن-
- مندرجہ ذیل شعر کی تقطیع کیجئے اور بحر کا نام بتایئے:-

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

کتابیات

۱	قواعد اردو	مولوی عبدالحق
۲	نسیم البلاغت	سید جلال الدین
۳	درسِ بلاغت	شمس الرحمٰن فاروقی
۴	معیار البلاغت	دیبی پرشاد
۵	آئینہ بلاغت	مرزا عسکری
۶	اردو محاورے	فخر الدین صدیقی اثر
۷	اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی و لسانی پہلو	ڈاکٹر یونس اگاسکر
۸	اردو کی لسانی تشکیل	ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ
۹	نسوانی محاورے	وحیدہ نسیم
۱۰	اصنافِ ادب اردو	ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر خلیق انجم
۱۱	جدید اردو شاعری	عبدالقادر سروری
۱۲	لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	ڈاکٹر عبداللیث صدیقی
۱۳	دہلی کا دبستانِ شاعری	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
۱۴	اردو زبان کا ارتقاء	ڈاکٹر شوکت سبزواری
۱۵	تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ
۱۶	تاریخ ادب اردو	جمیل جالبی
۱۷	اردو ادب کی تاریخ	نسیم احمد قریشی
۱۸	تاریخ زبان اردو	پروفیسر مسعود حسین خاں
۱۹	نکاتِ نستعلیق	وحید ارشد
۲۰	صحیفۂ خوشنویساں	مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی

تمام کتابیں بغیر مالی فائدے
کے پی ڈی ایف کی جاتی ہیں۔
مصنف سے ہمارا متفق ہونا
ضروری نہیں۔

سید حسین احسن۔
فیس بک گروپ
کتابیں پڑھئے۔
03146951212
03448183736